

بالکل مناظرانہ اصول پر ہے، یعنی ان سے مقصود محض مخالف کو جواب دہ ساکت کرنا ہے، نہ تحقیقین شاید منطقیانہ نہ ہوں، بعض ایسے ہیں جو الٹ کر بجنہ آریون کی طرف سے خود معترف ہیں، وار د ہو سکتے ہیں، بہر حال مسلمان مناظرین کے لئے یہ سلع بہت کچھ مفید ہیں، اور مکتبہ جامعہ اپنی جماعت کے لئے اور طلباء مدارس عربیہ کے لئے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے مولانا آزاد سحانی کے یہ ابتدائی کارنامے ہیں اور وقت کے قابل ہیں، لکھائی چھپائی صفحہ ۱۶۰، تقطیع چھوٹی، پتہ: منیجر مکتبہ، اکہیہ جامعہ کانپور،

سفر آخرت، یہ ایک مختصر سا رسالہ مولوی ابوتراب عبدالرحمن صاحب گیلانوی بہار عامہ اہل اسلام کے لئے لکھا ہے، اور جبکہ گیلانی صوبہ بہار کی انجمن تبلیغ الاسلام نے شائع کیا اس رسالہ میں بیماری کے وقت سے موت تک کے ان ضروری اعمال کی تشریح کی گئی ہے جو اسلام کے رد سے ضروری اور قابل عمل ہیں، اور جن سے افسوس ہے کہ عوام واقف نہیں، و صدقہ، تجہیز تکفین وغیرہ کے ضروری سائل بھی آگئے ہیں، یہ انجمن گیا، اور بہار گلپور کے بہار علاقوں میں غمہ کام کر رہی ہے، ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے،

انجمن تبلیغ الاسلام، گیلانی، ڈاکخانہ برکبہ، ضلع مونگیر، قیمت ۲

دارالمستفین کی جدید مطبوعات

ارض القرآن - جلد دوم از مولانا سید سلیمان ندوی قیمت ۴

مکالمات برکے - از مولوی عبدالمجید بی۔ اے قیمت ۴

برکے - از مولوی عبدالباری ندوی قیمت ۴

منیجر

جلد چہارم ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۷ مطابق اگست ۱۹۳۶ء

عدد دوم

مضامین

شذرات

توجہ کی ماہیت نفسی

۸۸ - ۸۲

مولوی عبدالمجید صاحب بی۔ اے

۹۶ - ۸۹

مولوی ابوالحسن صاحب ندوی

۱۰۹ - ۹۸

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

۱۱۹ - ۱۱۰

مولوی محمد سعید صاحب انصاری

۱۲۹ - ۱۲۰

۱۳۶ - ۱۳۰

مسند بریل

۱۴۲ - ۱۳۸

۱۴۶ - ۱۴۵

۱۴۸ - ۱۴۶

۱۵۱ - ۱۴۹

۱۵۳ - ۱۵۲

۱۵۶ - ۱۵۴

۱۵۸ - ۱۵۶

۱۶۰ - ۱۵۹

حکیم مہدی

تصوف اور تناسخ

خلافت اور علمائے یورپ

بندہ اور انسان

اخبار علمیہ

نامہ شبلی و سرسید

ادبیات

بزم سخن، اکبر، اقبال احمد شہیل،

انتقاد

تاریخ التعلیم و اکثر ضیاء الدین احمد

مطبوعات جدیدہ

مشاہیر زبان درود، علم نباتات، آئینہ تفسیر، مہ

میلاد تہذیب، ارغوان گلکشتہ

شکشا

جنگ کے موقع نے مغربی تہذیب و شائستگی کے جو خط و خال پیش کئے ہیں وہ اہل فطرت سے مخفی نہیں۔ اس سلسلہ میں مغرب کی ممتاز ترین قوم امریکہ کا ایک مخصوص کارنامہ جسکی اطلاع نیویارک ٹائمس کی وساطت سے ہندوستان پہنچی ہے، اس قابل ہے کہ اہل مشرق اس سے پوری طرح روشناس ہوں،

جرمنی کا قوی ترین حربہ اسکا سائنس تھا، علوم طبیعیہ کی مدد سے اُس نے قتل و خونریزی کے ایسے حیرت انگیز آلات و وسائل ایجاد کئے کہ اتحاد میں دنگ رہ رہ جاتے تھے، امریکہ کے تازہ دم ہیروں نے جرمنی کے ہاتھ میں قدم رکھا اور دیر تک زور آزمائی کے بعد اُسے نظر آیا کہ حریف کسی طرح زیر نہیں ہوتا، تو بالآخر اُس نے بیچ اختیار کیا، اس کے ہاں ایک بزرگ پروفیسر لوئس ہیں جو فنِ کیمیا کی مشہور ترین انتہائی کمال کا مرتبہ رکھتے ہیں انھوں نے اپنے کمال فن سے ایک زہر اس قسم کا ایجاد کیا جسکے محض مس ہوجانے سے انسان و حیوان ہی نہیں نباتات کی زندگی بھی فوراً ختم ہوجاتی ہے، اس زہر کا نام موجد و مکتشف کے اسم گرامی کے انتساب سے "لوئس" رکھا گیا، اور غیر معمولی اہتمام و رازداری کے ساتھ چند ماہ میں اس زہر کا ایک غیر محدود ذخیرہ تیار کیا گیا اور یہ پایا کہ تین ہزار ٹن (یعنی تقریباً ۸۲ ہزار من) کی تعداد میں اس زہر کو ہوائی جہازوں میں لیجا کر قصبہ کی مملکت برسا دیا جائے، اتفاق سے عین اسی زمانہ میں انوائس جنگ ہو گیا اور صلح کی گفتگو ہونے لگی، اور اس طرح موت و ہلاکت کی اس قیامت خیز بارش کی برکتوں سے محروم رہ گئی،

جہاں ابھی مشرق کو مغرب سے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے،

جنگ کے اثرات و عواقب نے ایک بڑی حد تک یورپ کے نظام تعلیم کو درہم برہم کر دیا ہے، متعدد یونیورسٹیاں مالی حیثیت سے اس قدر زیر بار ہو گئی ہیں کہ مصارف کا سہارا نہ دیا ہو گیا ہے، اسکاٹ لینڈ کی سب سے مشہور یونیورسٹی ایڈنبرا یونیورسٹی ہے، اس کے محصلین صرف فیس کی مدد میں ۵۰ ہزار پونڈ (۱۰ لاکھ روپے) کی کمی ہو گئی ہے! اس پر دوسرے ابواب کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

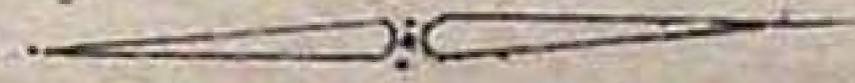
آکسفورڈ کی کیمبرج اس وقت دنیا کی ممتاز ترین یونیورسٹیاں ہیں، جو اب تک سرکاری امداد سے بالکل آزاد زندگی بسر کرتی رہی ہیں، لیکن جنگ نے انہیں بھی اتنا ہی دست کر دیا ہے کہ اپنی تاریخ میں بالکل پہلی بار انہیں حکومت سے اعانت طلب کرنا پڑی ہے، دنیا کی کوئی حکومت کسی تعلیم گاہ کو بالکل بلا معاوضہ مدد نہیں دیتی، انگریزی حکومت بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، اس کے دست کرم کو جنبش ہوئی، لیکن قدرتی طور پر اُس نے چند شرائط کی پابندی بھی لازمی قرار دیدی ہے، یہ شرائط و قیود ان یونیورسٹیوں کے ارکان کے لئے سخت ناخوشگوار ہیں، لیکن حالات کی نامساعدت نے یہ نوبت پہنچا دی ہے کہ یونیورسٹیوں کو اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے غالباً اپنی آزادی فروخت کرنے پر مجبور ہوجانا پڑے،

لیکن اس افلاس و مسرت کو مستقل نہ سمجھنا چاہیے، افلاس کا اصلی سبب طلبہ کا قحط ہوتا ہے، لیکن جنگ خاتمہ کے ساتھ طلبہ نہایت کثیر تعداد میں داخل ہونا شروع ہو گئے ہیں، اعداد ذیل سے معلوم ہو گا کہ کیمبرج یونیورسٹی میں جنگ سے پیشتر طلبہ کی سالانہ تعداد کیا رہتی تھی، دوران جنگ میں کیا رہی اور اب پھر کیا ہے۔

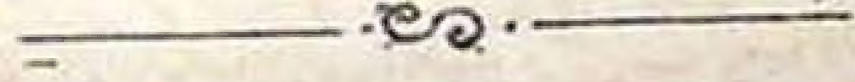
سال	تعداد طلبہ	سال	تعداد طلبہ
۱۳۰۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۲ھ	۷۳۷
۱۳۰۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۳ھ	۷۳۷
۱۳۰۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۴ھ	۷۳۷
۱۳۰۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۵ھ	۷۳۷
۱۳۰۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۶ھ	۷۳۷
۱۳۰۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۷ھ	۷۳۷
۱۳۰۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۸ھ	۷۳۷
۱۳۰۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۰۹ھ	۷۳۷
۱۳۰۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۰ھ	۷۳۷
۱۳۱۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۱ھ	۷۳۷
۱۳۱۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۲ھ	۷۳۷
۱۳۱۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۳ھ	۷۳۷
۱۳۱۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۴ھ	۷۳۷
۱۳۱۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۵ھ	۷۳۷
۱۳۱۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۶ھ	۷۳۷
۱۳۱۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۷ھ	۷۳۷
۱۳۱۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۸ھ	۷۳۷
۱۳۱۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۱۹ھ	۷۳۷
۱۳۱۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۰ھ	۷۳۷
۱۳۲۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۱ھ	۷۳۷
۱۳۲۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۲ھ	۷۳۷
۱۳۲۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۳ھ	۷۳۷
۱۳۲۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۴ھ	۷۳۷
۱۳۲۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۵ھ	۷۳۷
۱۳۲۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۶ھ	۷۳۷
۱۳۲۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۷ھ	۷۳۷
۱۳۲۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۸ھ	۷۳۷
۱۳۲۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۲۹ھ	۷۳۷
۱۳۲۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۰ھ	۷۳۷
۱۳۳۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۱ھ	۷۳۷
۱۳۳۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۲ھ	۷۳۷
۱۳۳۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۳ھ	۷۳۷
۱۳۳۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۴ھ	۷۳۷
۱۳۳۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۵ھ	۷۳۷
۱۳۳۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۶ھ	۷۳۷
۱۳۳۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۷ھ	۷۳۷
۱۳۳۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۸ھ	۷۳۷
۱۳۳۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۳۹ھ	۷۳۷
۱۳۳۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۰ھ	۷۳۷
۱۳۴۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۱ھ	۷۳۷
۱۳۴۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۲ھ	۷۳۷
۱۳۴۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۳ھ	۷۳۷
۱۳۴۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۴ھ	۷۳۷
۱۳۴۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۵ھ	۷۳۷
۱۳۴۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۶ھ	۷۳۷
۱۳۴۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۷ھ	۷۳۷
۱۳۴۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۸ھ	۷۳۷
۱۳۴۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۴۹ھ	۷۳۷
۱۳۴۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۰ھ	۷۳۷
۱۳۵۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۱ھ	۷۳۷
۱۳۵۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۲ھ	۷۳۷
۱۳۵۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۳ھ	۷۳۷
۱۳۵۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۴ھ	۷۳۷
۱۳۵۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۵ھ	۷۳۷
۱۳۵۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۶ھ	۷۳۷
۱۳۵۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۷ھ	۷۳۷
۱۳۵۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۸ھ	۷۳۷
۱۳۵۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۵۹ھ	۷۳۷
۱۳۵۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۰ھ	۷۳۷
۱۳۶۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۱ھ	۷۳۷
۱۳۶۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۲ھ	۷۳۷
۱۳۶۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۳ھ	۷۳۷
۱۳۶۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۴ھ	۷۳۷
۱۳۶۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۵ھ	۷۳۷
۱۳۶۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۶ھ	۷۳۷
۱۳۶۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۷ھ	۷۳۷
۱۳۶۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۸ھ	۷۳۷
۱۳۶۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۶۹ھ	۷۳۷
۱۳۶۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۰ھ	۷۳۷
۱۳۷۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۱ھ	۷۳۷
۱۳۷۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۲ھ	۷۳۷
۱۳۷۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۳ھ	۷۳۷
۱۳۷۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۴ھ	۷۳۷
۱۳۷۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۵ھ	۷۳۷
۱۳۷۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۶ھ	۷۳۷
۱۳۷۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۷ھ	۷۳۷
۱۳۷۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۸ھ	۷۳۷
۱۳۷۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۷۹ھ	۷۳۷
۱۳۷۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۰ھ	۷۳۷
۱۳۸۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۱ھ	۷۳۷
۱۳۸۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۲ھ	۷۳۷
۱۳۸۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۳ھ	۷۳۷
۱۳۸۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۴ھ	۷۳۷
۱۳۸۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۵ھ	۷۳۷
۱۳۸۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۶ھ	۷۳۷
۱۳۸۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۷ھ	۷۳۷
۱۳۸۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۸ھ	۷۳۷
۱۳۸۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۸۹ھ	۷۳۷
۱۳۸۹ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۰ھ	۷۳۷
۱۳۹۰ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۱ھ	۷۳۷
۱۳۹۱ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۲ھ	۷۳۷
۱۳۹۲ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۳ھ	۷۳۷
۱۳۹۳ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۴ھ	۷۳۷
۱۳۹۴ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۵ھ	۷۳۷
۱۳۹۵ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۶ھ	۷۳۷
۱۳۹۶ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۷ھ	۷۳۷
۱۳۹۷ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۸ھ	۷۳۷
۱۳۹۸ھ	۱۱۷۷	۱۳۹۹ھ	۷۳۷
۱۳۹۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۰ھ	۷۳۷
۱۴۰۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۱ھ	۷۳۷
۱۴۰۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۲ھ	۷۳۷
۱۴۰۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۳ھ	۷۳۷
۱۴۰۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۴ھ	۷۳۷
۱۴۰۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۵ھ	۷۳۷
۱۴۰۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۶ھ	۷۳۷
۱۴۰۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۷ھ	۷۳۷
۱۴۰۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۸ھ	۷۳۷
۱۴۰۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۰۹ھ	۷۳۷
۱۴۰۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۰ھ	۷۳۷
۱۴۱۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۱ھ	۷۳۷
۱۴۱۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۲ھ	۷۳۷
۱۴۱۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۳ھ	۷۳۷
۱۴۱۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۴ھ	۷۳۷
۱۴۱۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۵ھ	۷۳۷
۱۴۱۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۶ھ	۷۳۷
۱۴۱۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۷ھ	۷۳۷
۱۴۱۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۸ھ	۷۳۷
۱۴۱۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۱۹ھ	۷۳۷
۱۴۱۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۰ھ	۷۳۷
۱۴۲۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۱ھ	۷۳۷
۱۴۲۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۲ھ	۷۳۷
۱۴۲۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۳ھ	۷۳۷
۱۴۲۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۴ھ	۷۳۷
۱۴۲۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۵ھ	۷۳۷
۱۴۲۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۶ھ	۷۳۷
۱۴۲۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۷ھ	۷۳۷
۱۴۲۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۸ھ	۷۳۷
۱۴۲۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۲۹ھ	۷۳۷
۱۴۲۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۰ھ	۷۳۷
۱۴۳۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۱ھ	۷۳۷
۱۴۳۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۲ھ	۷۳۷
۱۴۳۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۳ھ	۷۳۷
۱۴۳۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۴ھ	۷۳۷
۱۴۳۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۵ھ	۷۳۷
۱۴۳۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۶ھ	۷۳۷
۱۴۳۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۷ھ	۷۳۷
۱۴۳۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۸ھ	۷۳۷
۱۴۳۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۳۹ھ	۷۳۷
۱۴۳۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۰ھ	۷۳۷
۱۴۴۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۱ھ	۷۳۷
۱۴۴۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۲ھ	۷۳۷
۱۴۴۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۳ھ	۷۳۷
۱۴۴۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۴ھ	۷۳۷
۱۴۴۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۵ھ	۷۳۷
۱۴۴۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۶ھ	۷۳۷
۱۴۴۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۷ھ	۷۳۷
۱۴۴۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۸ھ	۷۳۷
۱۴۴۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۴۹ھ	۷۳۷
۱۴۴۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۰ھ	۷۳۷
۱۴۵۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۱ھ	۷۳۷
۱۴۵۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۲ھ	۷۳۷
۱۴۵۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۳ھ	۷۳۷
۱۴۵۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۴ھ	۷۳۷
۱۴۵۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۵ھ	۷۳۷
۱۴۵۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۶ھ	۷۳۷
۱۴۵۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۷ھ	۷۳۷
۱۴۵۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۸ھ	۷۳۷
۱۴۵۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۵۹ھ	۷۳۷
۱۴۵۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۰ھ	۷۳۷
۱۴۶۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۱ھ	۷۳۷
۱۴۶۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۲ھ	۷۳۷
۱۴۶۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۳ھ	۷۳۷
۱۴۶۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۴ھ	۷۳۷
۱۴۶۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۵ھ	۷۳۷
۱۴۶۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۶ھ	۷۳۷
۱۴۶۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۷ھ	۷۳۷
۱۴۶۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۸ھ	۷۳۷
۱۴۶۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۶۹ھ	۷۳۷
۱۴۶۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۰ھ	۷۳۷
۱۴۷۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۱ھ	۷۳۷
۱۴۷۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۲ھ	۷۳۷
۱۴۷۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۳ھ	۷۳۷
۱۴۷۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۴ھ	۷۳۷
۱۴۷۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۵ھ	۷۳۷
۱۴۷۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۶ھ	۷۳۷
۱۴۷۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۷ھ	۷۳۷
۱۴۷۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۸ھ	۷۳۷
۱۴۷۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۷۹ھ	۷۳۷
۱۴۷۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۰ھ	۷۳۷
۱۴۸۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۱ھ	۷۳۷
۱۴۸۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۲ھ	۷۳۷
۱۴۸۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۳ھ	۷۳۷
۱۴۸۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۴ھ	۷۳۷
۱۴۸۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۵ھ	۷۳۷
۱۴۸۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۶ھ	۷۳۷
۱۴۸۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۷ھ	۷۳۷
۱۴۸۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۸ھ	۷۳۷
۱۴۸۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۸۹ھ	۷۳۷
۱۴۸۹ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۰ھ	۷۳۷
۱۴۹۰ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۱ھ	۷۳۷
۱۴۹۱ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۲ھ	۷۳۷
۱۴۹۲ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۳ھ	۷۳۷
۱۴۹۳ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۴ھ	۷۳۷
۱۴۹۴ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۵ھ	۷۳۷
۱۴۹۵ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۶ھ	۷۳۷
۱۴۹۶ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۷ھ	۷۳۷
۱۴۹۷ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۸ھ	۷۳۷
۱۴۹۸ھ	۱۱۷۷	۱۴۹۹ھ	۷۳۷
۱۴۹۹ھ	۱۱۷۷	۱۵۰۰ھ	۷۳۷



پی ایچ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری اب تک یورپ میں صرف جرمنی و اسٹریا کی یونیورسٹیوں کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی، چنانچہ ممالک غیر کے جن طلبہ کو یہ ڈگری لینا ہوتی، انہیں بالعموم جرمن یونیورسٹیوں ہی میں داخل ہونا پڑتا تھا، لیکن حال میں انگریزی یونیورسٹیوں میں جو متعدد اصلاحات ہوئی ہیں، اسی سلسلہ میں لندن و کیمبرج میں بھی یہ ڈگری قائم ہو گئی ہے، آئندہ سے برطانیہ و ممالک ماتحت برطانیہ کے جو طلبہ یورپ میں تخریج حاصل کرنا چاہیں گے، انہیں سفر جرمنی کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔



مشہور مستشرق پروفیسر ای جی براؤن جو ایک عرصہ سے ایران و ادبیات ایران سے متعلق قابل خدمات انجام دے رہے ہیں، حال میں ایک اور تالیف سے فارغ ہوئے ہیں، جس کا نام "تاریخ و تمدن ایران" ہے، کتاب مذکور کیمبرج یونیورسٹی پریس میں زیر طبع ہے اور عنقریب شائع ہوگا۔



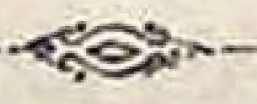
حضرت مسیح کی شخصیت مدت سے اہل یورپ کی ذہانت و طباعی کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے، حال میں ان کے ایک اہل قلم سٹر گلبرٹ سیدلر نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، کہ مسیح کی سرے سے کوئی تاریخی شخصیت نہ بلکہ اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں لوگوں نے مختلف محاسن اخلاق کی تعلیم مختلف افسانوں اور تخیلی قصوں کے ذریعہ دینے کے لئے اناجیل اربعہ کی ترتیب و تالیف کی، اور جیسا کہ عام دستور ہے افسانہ کا ایک ہیرو بھی فرض کر کے بعد کی نسلیں ان اخلاقی افسانوں کو تاریخی واقعات کا درجہ دینے لگیں، اور مسیح کو ایک تاریخی انسان قرار دے کر گویا انجیل مقدس، تمام تر آزاد و مرہوم کی نیرنگ خیال کی طرح حکایات تمثیلی کا مجموعہ ہے!

انجیل کی حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اس جدید مصنف کی تخیل کی غیر محدود و بلند پروازی میں کلام نہیں

یورپ میں یہ عجیب بات ہے کہ باوجود ضروریات زندگی کی انتہائی گرانی کے کتابوں کا حسن قبول برابر ترقی پر ہے، جنگ نے اچھے اچھے اغنیاء کو محتاج بنا دیا ہے، تاہم کتابوں کی قدر دانی میں فرق آنا کیسا، اس میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے، آج سے ۲۰ سال پیشتر شکسپیر کا مجموعہ کلام اسکے زمانہ کا چھاپا ہوا بالعموم دو سو پونڈ (دین ہزار روپیہ) میں فروخت ہوتا تھا، لیکن آج اسی ایڈیشن کی قیمت ۳ ہزار پونڈ (۴۴ ہزار روپیہ) تک پہنچ گئی ہے، ہندوستان کے جن ارباب ذوق کو اپنی علمی قدر شناسی پر ناز ہے اور جو اپنے نزدیک نوادر کتب کی فرہی میں غیر معمولی حوصلہ مندی کا اظہار کرتے ہیں، انھوں نے یہ خبر سنی ہے؟



۱۵-۲۰ سال سے لندن میں "عقلین" کی ایک مخصوص انجمن ریشنسٹ پریس ایوسی ایشن کے نام سے قائم ہے، اس کا مقصد اصلی یہ ہے کہ جن مطبوعات میں مسائل کائنات میں مذہبی و اعتقادی حیثیت سے قطع نظر کر کے عقلی نقطہ خیال سے آزادانہ بحث کی جاتی ہے، انہیں اپنے زیر اہتمام از سر نو طبع کر کے ارزان سے ارزان قیمت پر فروخت کرے، اس انجمن کی ابتدائی مطبوعات میں اسپنسر کی مشہور کتاب "ایجوکیشن" تھی، چند ماہ کے اندر کتاب مذکور کے ۳۰ ہزار نسخے نکل گئے، اور اب تک صرف ایک ایڈیشن کے ایک لاکھ سے زائد نسخے نکل چکے ہیں۔



اتفاق سے عین اسی زمانہ میں ایجوکیشن کا اردو ترجمہ بھی "فلسفہ تعلیم" کے نام سے شائع ہوا، مترجم خواجہ غلام الحسین بی۔ اے تھے، ترجمہ کی اشاعت انجمن ترقی اردو نے کی جس کے سکریٹری اس وقت مولانا شبلی مرحوم تھے، ترجمہ پر بہتر سے بہتر ریویو مدحیہ مولانا نذیر احمد، مولانا حالی، مولوی ذکا اللہ، ڈاکٹر اقبال کے قلم سے نکلے تھے، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بیان کوئی دوسرا ایڈیشن اسکے مقابلہ کو موجود نہ تھا، لیکن بایں ہمہ مساعدت حالات اس ۳۲ کروڑ کی دنیا میں اور اس ۵۰ سال کی طویل و عریض مدت میں "فلسفہ تعلیم" کے فروخت شدہ نسخوں کی تعداد کیا ہے؟ کیا ایک لاکھ؟ کیا ۵۰ ہزار؟ کیا چند ہزار؟ کیا ایک ہزار؟

اسکے جواب میں تمام مدعیان حمایت اُردو کی نگاہیں شرم سے جھک جانا چاہیے۔

—*—

ریشلسٹ ایسوسی ایشن (انجمن عقلی) جسکا ذکر اچھی ہو چکا ہے، اسکا ایک ماہوار علمی رسالہ لٹری گارڈ کے نام سے نکلتا ہے، انجمن کے ایک ہندوستانی رکن سٹران۔ ایچ پانٹک نے جو مغربی ہند کے باشندہ ہیں رسالہ مذکور کو ایک سو پونڈ (پندرہ سو روپیہ) کی رقم اس غرض سے مرحمت کی ہے کہ رسالہ ہندوستان، چین اور سیلون کی تعلیم گاہوں میں مفت تقسیم کیا جائے۔

—*—

ہندو یونیورسٹی کے دائرہ کار مرکزی نقطہ سنٹرل ہندو کالج (بنارس) ہے، اسکی سالانہ روٹادو بابت ۱۹۱۸ء کا گذشتہ مین شائع ہوئی ہے اعداد ذیل سے جو اسی سے ماخوذ ہیں، اسکی ترقی رفتار کا اندازہ ہو سکیگا،

تعداد طلبہ	سالہ	۱۹۱۸ء
فوسٹ ایر	۱۹۲	۲۰۷
سکنڈ ایر	۱۹۱	۱۸۹
تھرڈ ایر	۷۴	۱۱۹
فورٹھ ایر	۱۰۷	۱۲۳
پوسٹ گریجویٹ کلاسز ایم اے، ایم ایس، سی فیر	۶	۴۵
کامیاب طلبہ فیصد		
ایف۔ اے	۶۳	۶۵
بی۔ اے	۳۸	۷۶
بی۔ ایس۔ سی	۳۳	۷۸

کالج میں پڑھانے والوں کی تعداد اسوقت ۴۲ ہے، جس میں آٹھ یونیورسٹی پروفیسر بھی شامل ہیں، یہ وہ تعداد ہے جسکے لحاظ سے صرف الہ آباد یونیورسٹی ہی نہیں، بلکہ مپٹہ، پنجاب اور بی بی کی یونیورسٹیوں کا بھی کوئی کالج ہندو کالج بنارس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تمام ہندوستان میں شاید صرف دو کالج ہیں جو اس حیثیت سے ہندو کالج پر تفوق رکھتے ہیں، ایک پریسڈنسی کالج کلکتہ جہاں ۴۳ پروفیسر اور لکچرر کام کرتے ہیں، دوسرے پریسڈنسی کالج مدراس جہاں انکی تعداد ۵۰ ہے۔

ہندو کالج کی ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی کی جماعتوں میں اسوقت تک ریاضی، سنسکرت، ادب انگریزی، فلسفہ، تاریخ، اقتصادیات، طبیعیات، کیمیا، حیوانیات (زواہجی) کی تعلیم کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، اور طلبہ ان سب مضامین میں تحصیل تکمیل فن کر رہے ہیں، انکے علاوہ ایک خاص صیغہ شعبہ تحقیقات عالیہ (ریسرچ) کا ہے، جس میں نسلک ہو کر طالبان علم، ماہرین فن کے زیر ہدایت تجربہ کمال فن پیدا کرتے ہیں، ۳۰ طلبہ کی مختصر جماعت اس خالص علمی خدمت میں مشغول ہے، ان میں سے نو کا تعلق ریاضیات سے ہے، دو کا قدیم تاریخ و فلسفہ ہند سے، اور ایک کا کیمسٹری سے،

کیا اعداد بالا کی خاموش زبان مسلم یونیورسٹی کے بلند بانگ علمبرداروں کو عبرت و بصیرت کا درس نہیں دے سکتی۔

—*—

اختلاف آراء تعلیمی مجلس دا انجمن میں ہوتا رہتا ہے، ہندو یونیورسٹی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اسکے ارکان میں باہم اختلاف ہے اور نہایت شدید اختلاف ہے، مادرن ریویو، ییڈر، نیوانڈیا وغیرہ کے صفحات انکی باہمی زد و آزمائشوں کے مدت سے تماشگاہ بنے ہوئے ہیں، لیکن با این ہمہ اختلاف و تحالف انکی نظر اصل کار سے نہیں ہٹتی، ریل میں اکثر مسافر جگہ کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں لیکن اپنی منزل مقصود کو کوئی نہیں بھول جاتا، یہ شرف صرف موجودہ مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے کہ وہ جس کشتی پر سوار ہوتے ہیں، آپس میں لڑ جھگڑ کر خود اسی کے غرق کرنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں،

مقالات

توجہ کی ماہیت نفسی

از مولوی عبدالماجد بنی - ۱۔ ایم، آراسہ ۱۰ ایس

روزمرہ کا تجربہ ہے کہ بعض اشخاص کے مشاغل بہ کثرت ہوتے ہیں، وہ ایک ہی زمانہ میں متعدد و مختلف النوع مشاغل میں مصروف رہتے ہیں، اور بسکویکسان ذوق و شوق سے انجام دیتے ہیں، بعض اشخاص اسکے برخلاف ایسے ہوتے ہیں جو ایک وقت میں صرف ایک ہی چیز کو لے سکتے ہیں، انکی دلچسپیاں بہت ہی محدود ہوتی ہیں، وہ ایک سے زائد چیزوں پر صرف توجہ نہیں کر سکتے، البتہ جس چیز کو ہاتھ لگاتے ہیں، اسکے ساتھ انہیں غایت یکسوئی و انہماک ہوتا ہے، اور گویا وہ اسی کے پورے ہیں۔ عام افراد سے گذر کر یہ نوعی فرق دنیا کے شاہیر میں بھی پایا جاتا ہے، پتولین ایک وقت میں بے تکلف متعدد اہم خدمات انجام دیتا تھا، سیزر عظیم ایک ساتھ کئی کام کرتا تھا، سر سید احمد خان ایک ہی وقت میں مذہبی تصنیف و تالیف کرتے تھے، کالج کی تعمیرات اپنی ذاتی نگرانی میں تیار کرتے تھے، کالج و بورڈنگ کے اندرونی انتظامات کرتے تھے، سیاسی مسائل پر تقریریں کرتے، اور مضامین شائع کرتے، اور چندہ وصول کرنے کے لئے دورہ کرتے تھے، مولانا شبلی شاعر بھی تھے، ناقد بھی، مورخ بھی، ایڈیٹر بھی، نندہ کے کارکن بھی، لکچرر بھی، سیاسی بیداری کے مضامین لکھنے والے بھی، اور وقف علی الاولاد کے متعلق قوم میں جوش و خروش پھیلانے والے بھی، مسز انجی لسنٹ ایک ہی وقت میں ہفتہ وار، ماہوار، دروازہ پرچون کی ایڈیٹری، سیاسی انجمنوں کی صدارت، فلسفیانہ

ستمبر ۱۸۸۷ء کے معارف میں ہم نے قدیم قلمی تصنیفات کی فراہمی و حفاظت کی ایک تحریک اپنی ہمدردان علم کے سامنے پیش کی تھی، اور نندہ اور کافر نفس کو خاص طور سے اوہر متوجہ کیا تھا، گذشتہ اجلاس سورت میں جناب مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کو گجرات کے علمی خزانوں کی تباہی کو اپنی طرف سے دیکھنے کا موقع ملا، جس نے انکے دل کو بڑا صدمہ پہنچایا، چنانچہ اجلاس سے فارغ ہو کر انھوں نے قلمی کتابوں کی حفاظت کی اپیل قوم میں پیش کی اور تو کہیں سے جواب نہیں ملا، لیکن دکن کی سرزمین پر ایک سراپا درد بزرگ (نواب عماد الملک) جسکی نظر میں اپنے اسلاف کے پرانے اندوختوں کی اب تک قدر اس نے یہ اپیل سن کر انھوں کے آنسو بہائے اور فوراً اس کام کے آغاز کے لئے ایک ہزار روپیہ اپنے جیب سے دیا، ارض دکن سے ابھی اور بہت کچھ توقع ہو اور وہ انشا اللہ پوری ہو کر رہیگی،

یہ کام اس قدر اہم اور وسیع ہے کہ لاکھوں روپے اسکے لئے ناکافی ہیں، بہتر ہوتا اگر ہماری تین چار انجمنیں، نندہ، کافر نفس، دیوبند، مستشار العلماء لاہور، مدرسہ اسلامیہ پشاور وغیرہ اس کام کو مل کر کر لیں، افسانے اپنے احاطہ عمل کو تقسیم کر لیں، وار لمصنفین، ابھی کس شمار میں ہوتا ہم وہ بھی بقدر حوصلہ شرکت کو تیار ہے۔



ان سال اجلاس نندہ اور سفر حیدر آباد کی بدولت دکن کے متعدد پرانے شروان اور یادگاروں کے دیکھنے موقع ملا، کہیں کہیں ناد قلمی کتابوں کی زیارت بھی نصیب ہوئی، اردو کی بعض بعض نہایت قدیم نئی ولی دکن سے پہلے کی کتابیں تصوف و عقائد میں نظر آئیں، اور دوا دین اور نظم کی کتابیں تو بکثرت ملیں، عبداللہ قطب شاہ کا دیوان جناب مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے ہاتھ آیا ہے، اس عہد کی ایک شہنشاہی ایک اور شخص کے پاس دیکھی، منظم عقائد کی ایک کتاب وار لمصنفین کے قسمت میں آئی،

ان کتابوں کو دیکھ کر ہم اس نظریہ پر پہنچے ہیں کہ اردو زبان کی تحریری پیدائش درحقیقت تصوف اور مذہب کے بطن سے ہوئی ہے۔

تصنیف و تالیف، صوفیانہ مجالس کی رہنمائی و سیاوت وغیرہ متعدد مختلف انواع و اقسام کی دیتی ہیں، ایک طرف اس طرح کے عامۃ الورد و دماغون کی مثالیں ملتی ہیں، دوسری طرف مشاہیر جماعت میں ایسے افراد بھی ملتے ہیں، جنکا دائرہ ذوق بہت ہی محدود ہوتا ہے، مگر وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں تنہا اس میں متغریق ہو جاتے ہیں، سقراط جب کھڑے کھڑے کسی مسئلہ کو سوچنے لگتا، ساری ساری رات ایک وضع سے کھڑے کھڑے گزار دیتا، اور اسے کچھ خبر نہ ہوتی، بیوقوف ہر کسی مسئلہ کی ادھیڑ میں ہوتا تو کمانے کے کئی کئی وقت گزر جاتے، اور اسے کمانے کا خیال نہ آتا، ہر گیل جو وقت اپنی ایک اہم تصنیف کی ترتیب میں مشغول تھا، شہر پر گولہ باری ہوتی رہی اسے ذرا خبر نہ ہوتی، زمانہ حال کا ایک مصنف ایسا ہے جو تصنیف و تالیف کے وقت ہر قسم کے شور و غل سے بالکل غیر متاثر رہتا ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ قوت توجہ کے لحاظ سے دماغ انسانی کی ساخت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک اس قسم کے دماغ ہوتے ہیں جنہیں شعور کے خطوط عموماً متفرق، منتشر اور پہلے ہوئے ہوتے ہیں، دوسرے قسم کے دماغون میں یہ خطوط اکثر کسی ایک نقطہ پر یکجا و مجتمع رہتے ہیں، پہلی قسم کے دماغ کے افراد اپنی وسعت نظر، جامعیت، وہمہ گیری کے لحاظ سے ممتاز ہوتے ہیں، اور دوسری قسم کے افراد اپنی وقت نظر، عمق، و نکتہ رسی کے لحاظ سے دماغ کی یہ نوعیت ایک بڑی حد تک ودیعت فیہ ہی ہوتی ہے، اکتساب و تربیت سے بھی چھل ہو سکتی ہیں، مگر بہت قلیل حد تک۔

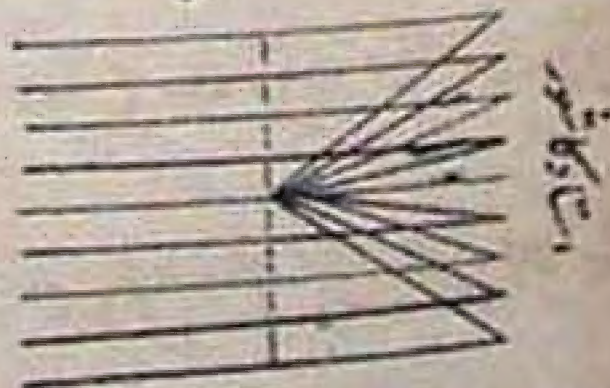
ان دونوں قسموں کے دماغون کو قطیعت کے ساتھ ایک دوسرے پر ترجیح دینا ممکن نہیں اپنی اپنی جگہ پر دونوں بہت قابل قدر ہیں، اور ارتقا کائنات کے حق میں دونوں کا وجود ضروری ہے، البتہ یہ کہنا بھی نہیں کہ بعض مخصوص علوم و فنون کو ایک قسم کے دماغ سے زیادہ مناسب ہوتی ہیں اور بعض کو دوسرے سے، اہلیات و منطوق وغیرہ بعض ایسے خالص علوم و ذہنی ہیں، جن پر توجہ کرنے

سبق پر کس حد تک استاد کی توجہ مبذول رہنی چاہیے، ان مدارج توجہ کی توضیح اشکال ذیل کی وساطت سے برآسانی ہو جائیگی۔



(طلبہ کا شعور تا سب سے پہلے کو اپنا مرکز بنائے ہوئے ہے)

دیکھ کر انسانی حواس
(استاد کے شعور کا ایک جزو بن کر اپنا
مرکز بنائے ہوئے ہوتا ہے جو اپنا مرکز بنائے ہوئے ہے)



سبق

یہ بھی اسبقہ رہیں :-

(۱) خلق نامناسبیت - بیشتر افراد کو بعض مضامین سے خلق نامناسبیت ہوتی ہے تاہم کسی نہ کسی مضمون سے انہیں ذوق ضرور ہوتا ہے، ایسے اشخاص کو چاہیے کہ اپنے مرغوب و دلکش مضامین کی وسعت سے غیر مرغوب و غیر دلکش مضامین سے مناسبت پیدا کریں، کیونکہ ہر مضمون کسی نہ کسی حیثیت سے دوسرے مضامین سے ضرور کچھ تعلق و وابستگی رکھتا ہے، دانشمند استاد کا فرض ہے کہ اپنے طلبہ کے فطری ذوق و رجحان کو پہچانے، اور جو مضامین ان کے مذاق کے موافق ہوں، ان کے ذریعہ دوساطت سے ان کے مخالف مذاق مضامین کو ان کے لئے خوشگوار بنائے۔

(۲) تردد و پریشانی - انتشار ذہنی، بجاہتہ یکسوئی کے لئے منافی ہے۔

(۳) اجنبیت و غرابت - اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ دلکشی کے لئے یہ لازمی ہے کہ مہیج ایک حد تک مانوس و مألوف ہو، بالکل نامانوس مہیج سے ذہن کو طبعاً وحشت ہوتی ہے۔

(۴) ذکاوت و ذہانت - اے روشنی طبع تو برین بلا شدی "ہمارے ہاں ایک عام ضرب الشل ہے اور فطری ذکاوت و ذہانت کی روشنی، واقعی اکثر حالتوں میں توجہ و انہماک کے حق میں بلا ہی ثابت ہوتی ہے، ذہین افراد اکثر اپنی خوش و مانگی کے اعتما و پر غور و توجہ کو اپنے لئے بالکل غیر ضروری خیال کرتے ہیں، اور اس کی اگر شروع ہی میں روک تمام نہ کی گئی تو بالآخر یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے، یعنی قیام توجہ، کوشش کے بعد ہی ناممکن ہو جاتا ہے، استاد کا فرض ہے کہ ذہین طلبہ سے خاص طور پر سوالات کیا کرے، جن سے ان پر یہ واضح ہو جائے کہ ترقی کے لئے محض ذہانت بیسود ہے، تاوقتیکہ غور و توجہ کی بھی آمیزش نہ ہو۔

(۵) مہیج میں عدم تنوع - اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دلکشی کا ایک بڑا عنصر مہیج کا تنوع ہے، جس مہیج میں ضرورت سے زیادہ دیر تک یکسانیت قائم رہتی ہے، اس سے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے، جو استاد مسلسل زبانی تقریر کرتا ہے، طلبہ اس سے اکتا جاتے ہیں، دانشمند استاد کچھ دیر مسلسل تقریر کرتا ہے۔

دو چار صفحہ اوپر ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ غلام غلام اسباب و حالات، مویذات توجہ کا کام دیتے ہیں، اب ایک نظر ملاحظہ توجہ پر بھی کرنا ہے، یعنی ان اسباب و حالات پر جو ذہن کو کسی شے پر توجہ کا صرف کرنے سے روکتے ہیں، یہ موانع دو طرح کے ہو سکتے ہیں، مادی و ذہنی، پہلے موانع مادی کو توجہ کی (۱) ضعف جسمانی - خواہ وہ کسی مستقل مرض کا نتیجہ ہو، یا عارضی اضمحلال طبع سے پیدا ہو گیا ہو، دونوں صورتوں کا حاصل ایک ہی ہے، کہ کمزور قوی زبردست سعی توجہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

(۲) خستگی و تھکان - یہ بھی اسی ضعف جسمانی کی ایک مخصوص شکل ہے۔

(۳) شور و غل - توجہ نام ہے یکسوئی کے ساتھ ایک مہیج سے مشغولیت کا، اور جب متعدد مہیجات جلب توجہ کے لئے کشمکش کریں گے تو ظاہر ہے کہ نفس کسی ایک پر دہری توجہ نہ کر سکیگا، اسی لئے سکون و خلوت کو یکسوئی کے لئے لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔

(۴) نامناسب ماحول - گھر میں تازہ ہوا کا نہ ہونا، بہت زیادہ گرمی، بہت زیادہ سردی وغیرہ ان سب صورتوں میں اعصاب و مانعی جدوجہد کے ناقابل ہو جاتے ہیں، اور یکسوئی میں لازماً خلل پڑتا ہے۔ (۵) نامناسب ہیئت جسمی - یکسوئی میں ہر شخص کو اس کی مخصوص وضع و ہیئت جسمی بھی خاص طور پر ہوتی ہے، اور جب کبھی اسکے خلاف ہوتا ہے تو قیام توجہ میں سخت دشواری ہوتی ہے، بعض شے فکر سخن کے وقت ٹہلتے رہتے ہیں، اور اس حالت میں مضامین شعر پر انکی توجہ خوب قائم رہتی ہو جاتی ہے، اگر انہیں ٹہلنے سے روک دیا جاتا ہے تو مضمون بھی گم ہو جاتا ہے۔ اکثر کم عمر طلبہ ہل ہل کر پڑھتے ہیں، انکی حرکت جسم و حرکت دماغ کے درمیان ایک خاص طرح کا تناسب معلوم ہوتا ہے، اگر جسمانی کا ہلی وستی دماغی کا ہلی وستی کے مرادف ہوتی ہے، اور عموماً جو وقت نظام جسم چاق و مستعد ہوتا ہے، اسی وقت دماغ بھی مستعدی و چستی سے کام کرتا ہوتا ہے، لیکن یہ کوئی قطعی کلیہ نہیں۔

اب موانع ذہنی پر نظر کرنا چاہیے، انکی اہمیت بھی موانع مادی سے کچھ کم نہیں، اور تعداد

کچھ دیر طلبہ سے سوال وجواب کرتا ہے، کچھ دیر اپنے نوٹ تحریر کرتا ہے، و قس علی ہذا۔

اکثر کتابوں میں اس قسم کے واقعات پڑھے اور لوگوں کی زبانی سنے ہونگے کہ فلاں شخص جو اپنے زمانہ کا بہت بڑا حکیم یا فلسفی تھا، بعض حیثیات سے بالکل نا سمجھ تھا، اور بعض بالکل موٹی باتیں کہیں کہیں نہیں آتی تھیں، یہ واقعات بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت ان میں کوئی حیرت انگیز بات نہیں، شعور کا رجحان طبعی و میل فطری، انتشار اور پھیلاؤ کی جانب ہے، اور قصداً ہمیں جماع و مرکزیت پر کرتے رہنا، اسے ایک غیر طبعی حالت میں رکھنا ہے۔ اسکے یہی معنی ہیں کہ عرصہ دراز تک توجہ کو یکسو رکھنے پر دماغ پر سخت زور پڑتا ہے، دماغی خشکی محسوس ہونے لگتی ہے، اور دماغ میں دوسرے مشاغل کی جانب ملتفت ہونے کی صلاحیت بہت گھٹ جاتی ہے، یہ قول اسپنسر کے فطرت بڑی سخت محاسب ہے کہ کسی ایک مدین زیادہ خرچ ہو جاتا ہے تو وہ دوسری مدون سے اتنا ہی کاٹ لیتی ہے، پس کسی شے پر کامل مرکزیت و یکسوئی کے ساتھ صرف توجہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دوسری چیزوں کی طرف توجہ کم ہو اور عام قوت توجہ ایک بڑی حد تک ماند پڑ جائے، اور ظاہر ہے کہ بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ اپنی مختصر و پیش نظر مسائل پر خاص اہمک و یکسوئی صرف کرتے رہیں۔

عمل توجہ میں یہ نہیں ہوتا کہ انسان کے آلات حواس، بجز ایک سمت کے اور ہر طرف سے بالکل معطل ہو جائیں، وہ محسوس سب کچھ کرتا ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ دماغ پر اثر قائم صرف اسی شے کا ہوتا جو اسکے زیر توجہ ہوتی ہے، گویا ماحول سے بشمار تیر ایک ہی وقت میں شعور پر چلائے جاتے ہیں، مگر تھیک نشانہ پر ایک ہی تیر جا کر پیوست ہو جاتا ہے، باقی سب ہی اسپر پڑتے ہیں، مگر اچھٹے ہوئے آئے اور چوٹے ہوئے نکل گئے، بے توجہی کی حالت میں یہ نہیں ہوتا کہ انسان اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو دیکھتا یا سنتا ہو

بصارت و سماعت اپنے اپنے کام میں بدستور لگی رہتی ہیں، بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ اس وقت دماغ ان سے کوئی ذرا بھی پائدار اثر نہیں قبول کرتا، تہتجات درآور برابر داخل ہوتے رہتے ہیں، لیکن دماغ

کوئی قابل لحاظ نقش نہیں بناتے، بار بار دیکھا ہو گا کہ درجہ بین است۔ سبق پڑھا رہا ہے، اور اکثر طلبہ اسکی طرف سے بے التفات آپس میں باتیں کر رہے ہیں، اتنے میں استاد نے کوئی دلچسپ قصہ بیان کرنا شروع کیا، اس درجہ میں خاموشی چھا گئی، اور سب کے سب اس جانب متوجہ ہو گئے، استاد کی تقریر کے الفاظ انکے کانوں میں شروع سے آرہے تھے، لیکن پیشتر چونکہ انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی، اسلئے ان الفاظ سے ان کے دماغ میں کوئی مفہومی کیفیت نہیں پیدا ہوتی تھی، اور قصہ کے الفاظ چونکہ انکے لئے دلچسپی کا سامان کہتے تھے اسلئے جوہنی انکے دماغ تک پہنچے، دماغ نے ان سے اثر قبول کرنا شروع کیا، اور وہ بہت توجہ و اشتیاق سے فحیات توجہ میں ایک معرکہ الاراسلہ یہ ہے کہ نفس ایک وقت میں کتنی چیزوں پر توجہ قائم کر سکتا ہے، علماء نفس نے اسکے جواب میں بڑی بڑی موٹو گانیاں کی ہیں، لیکن اسکا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ صرف ایک پر۔ یہ بے شبہ ممکن ہے کہ وہ شے بجائے خود کثیر التعداد افراد یا اجزاء پر شامل ہو، لیکن نفس کے سامنے موجود ہونے کی حیثیت سے وہ حکم واحد ہی میں داخل ہوگی، انسان ایک ہزار روپیہ پر ایک ہی وقت میں توجہ بہ آسانی قائم کر سکتا ہے، لیکن کیونکر؟ ہزار روپیوں پر فرداً فرداً نہیں، بلکہ ایک ہزار کی مجموعی رقم پر، اور یہ جو اس طرح کے واقعات مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں کئی چیزوں پر متوجہ ہے، یا مثلاً اس طرح کی روایات کہ جو یس سیر ایک ساتھ چار چار خط اپنے ساتھیوں سے لکھواتا تھا، اور پانچواں خود لکھتا جاتا تھا، تو اس قبیل کے واقعات میں یہ نہیں ہوتا کہ انسان بعینہ ان اھد میں مختلف اشیاء پر توجہ کرتا رہے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مختلف اشیاء پر باری باری اس سرعت کے ساتھ اسکی توجہ منتقل ہوتی رہتی ہے، کہ سارا سلسلہ بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے، بجلی کے شرارے ایک سکند میں بشمار تعداد میں خارج ہوتے رہتے ہیں، لیکن دیکھنے میں بجلی کی ایک ہی لہر معلوم ہوتی ہے۔

ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، جو شخص نیکی کو پہچانتا ہے، وہ بدی سے بھی واقف ہوتا ہے، مشغولیت کے ضمن میں ناظرین بے غشی سے بھی واقف ہو گئے ہونگے، لیکن یہ بے غشی وہ توجہ کی ایک ایسی

عام کیفیت نفسی ہے کہ اسکے لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں، ہر شخص کو روزانہ زندگی میں ایسا تجربہ ہوتا رہتا ہے، آنکھیں کھلی ہوئی مگر نفا کسی شے پر قائم نہیں، کسی کام میں دل نہیں لگتا، بیکاری میں وقت گزرتا ہے، پلنگ یا آرام کرسی سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا، شور و غلی میں یہ خیال ضرور گزر رہا ہے کہ اُنکر فلان فلان کام کرنا چاہیے، لیکن کاہلی اٹھنے نہیں دیتی، عدم مشغولیت دماغ پر مسلط ہے، فاضل طلسمی (ریجک لیٹرن) کی تصویروں کی طرح جلد جلد ایک خیال دوسرے کی جگہ پر خود بخود آتا جاتا رہتا اور قوت فاعلی گویا بالکل معطل ہے۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ کے تعطل و بیکاری کے بعد از خود حرکت پیدا ہوتی ہے، قوت فاعلی از سر نو عود کرتی ہے، اور اس وقت پھر کوئی مشغولیت شروع ہو جاتی ہے، جس پر توجہ نام ہے، شعور میں انتہائی اجتماع و مرکزیت کا، اسی طرح بے توجہی اس کیفیت نفسی کا نام ہے، جب شعور انتہائی انتشار اور پھیلاؤ کی حالت میں ہو۔

صفحات بالا میں توجہ کی ماہیت نفسی اور اسکے اہم خصائص معلوم ہو چکے، توجہ کیا ہے، شعور سے اسکا کیا تعلق ہے، اسکے کتنے اقسام ہیں، کن کن حالات و اسباب سے پیدا ہوتی ہے، اسکی تربیت و ترقی کیونکر ہو سکتی ہے، اسکے موانع کیا کیا ہیں، ان تمام امور سے ہم واقف ہو چکے، لیکن توجہ کو تعلیم و فن تعلیم جو خاص و براہ راست تعلق ہے، اسکے لحاظ سے یہ مناسب ہو گا کہ خاتمہ پر اسکی تعلیمی تفریعات بھی ایک کر لیں، یعنی جو کچھ معلومات حاصل ہوئے ہیں، انہیں فن تعلیم پر چپان کر کے دیکھیں کہ ان سے اس فن کے متعلق کیا کیا نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

اس حقیقت سے ہم باخبر ہو چکے ہیں کہ نامانوس و غریب اشیاء سے ذہن کو طلباً و حشت ہوتی ہے، اسلئے مانوس اشیاء کو نامانوس اشیاء کی تعلیم کا زینہ بنانا چاہیے، یا دوسرے لفظوں میں، اسباق کو آسان و دشوار، اور معلوم سے نامعلوم کی طرف جانا چاہیے۔

جو چیزیں ہر وقت مشاہدہ و تجربہ میں آ سکتی ہیں، وہ یقیناً زیادہ صاف، آسان و قریب فہم ہوتی ہیں۔

بقابلہ ان سائل کے جسکا تعلق عقل و فکر سے ہوتا ہے، اس بنا پر کلیتہً بالا کے پہلو بہ پہلو یہ کلیتہً بھی قائم کر سکتے ہیں، کہ اسباق کو مادیات سے مجردات اور محسوسات سے معقولات کی جانب جانا چاہیے، بجائے اصل زبان و ادب کی دلچسپیوں سے طلبہ کو غور کرنے کے، شروع ہی میں انکو صرف و نحو کے خشک قواعد و اصول ازبر کرانے کے طریقہ کی سخت غلطی، ان ہر دو کلیات کو پیش نظر رکھنے کے بعد واضح ہو جاتی ہے۔

اس نکتہ سے بھی ہم آشنا ہو چکے ہیں کہ توجہ و کیسوئی سے دماغ پر کافی بار پڑتا ہے، جسکے تحمل کم عمر طلبہ نہیں ہو سکتے، اور عرصہ تک قیام توجہ پر قدرت حاصل کرنے کے لئے کافی مشق و تربیت کی ضرورت ہے، جسکی توقع بتدیون سے نہیں ہو سکتی، اس سے ہم باسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اسباق کی مدت بجائے طویل ہونے کے مختصر ہونا چاہیے۔

ہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ توجہ کا اصل الاصول ذوق و دلکشی ہے، اور ذوق کا جبر و تشدد سے پیدا ہونا ناممکن ہے، اسلئے بجز چند مخصوص صورتوں کے جبکہ سخت گیری لازمی ہو جاتی ہے، عموماً بجائے زور و کوب کے طلبہ کو سمجھا بوجھا کے تعلیم دینا چاہیے،

ذوق و دلکشی کا سب سے بڑا ضامن ہمت و ہمت کا تنوع ہے، تعلیم میں یقیناً اس اصول کو ہم چپان کر سکتے ہیں، اور اس نتیجہ تک یقین گے ساتھ پہنچ سکتے ہیں کہ اسباق میں تنوع و تغین ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ہندوستان کی گذشتہ اسلامی تعلیم گاہیں

(۱)

از مولوی ابوالحسنات ندوی رفیق دارالمصنفین

صاحب مضمون نے نہایت محنت اور جان کا ہی سے ایک رسالہ کی صورت میں یہ مضمون رقم و رقم لکھا۔
منقذہ بلکام بن پیش کرنے کے لئے لکھا تھا لیکن بعض اسباب سے ان کا جانا ہوا اسلئے اب یہ
سارف میں شائع کیا جاتا ہے، ناظرین پورے مضمون کو پڑھکر اندازہ کریں گے کہ وہ کس تلاش اور
محنت کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں کے علمی کارناموں کو علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسائل کے مختلف مضامین
میں تفصیل لکھا ہے، مصر، شام، ایران، روم، خراسان، عراق اور افریقہ میں مسلمانوں نے جتنے تعلیمی
ورکات تالم کئے، علامہ مہرور نے ان میں سے ایک ایک کے نام گنائے، اور ان کے حالات لکھیں مگر
سرزمین ہند کی نسبت جو ہمارا وطن ہے، اب تک کچھ نہیں لکھا گیا، علامہ مرحوم تو گویا ہندوستان میں اسلام
مدارس کے قیام کے ابتدائی منکرتھے، چنانچہ اپنے رسائل کے مضمون ”اسلامی مدارس میں کچھ“
”ہندوستان کے تذکرے میں ہکو بے خطر کہنا چاہیے کہ اس سرزمین پر شاید ایک عجیبی عمارت نہیں قائم ہوئی“
لیکن بعد ازیں بعض ارباب قلم کے توجہ دلانے پر علامہ مرحوم نے اپنی اس تحقیق سے رجوع کیا
اس عبارت پر حاشیہ دیکر طبع ثانی میں یہ الفاظ لکھے۔

”بین اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ تحقیق صحیح نہیں ثابت ہوئی، ہندوستان میں بہت
مدارس تعمیر ہوئے تھے گو اب انکا نام و نشان نہیں رہا“
تاہم اس اعتراف سے اصلی عقیدہ مکمل رکھا، اور اس بحث کی نسبت کوئی تفصیلی علم حاصل نہ ہوا۔

بڑی ضرورت تھی کہ اس ضروری مضمون کے متعلق جو کچھ معلومات ہوں انکو یکجا کر دیا جائے :-
اجمالی اشارات

اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون بہت اہم ہے، اسبقہ مشکل اور محنت طلب بھی ہے، اولاً اس
خاص عنوان کے لئے فارسی تاریخوں میں جو کچھ مواد ہیں وہ اسقدر منتشر اور ضمنی ہیں کہ ان پر شکل نگاہ پڑ سکتی ہے
تانیاً ان تاریخی کتابوں کا طرز تحریر قدیم مذاق تاریخ نویسی کے باعث کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اگر ہم گذشتہ زمانہ کی تمدنی
سیاسی، اور علمی حالات کو ان میں مبسوط و مفصل طور پر تلاش کرنا چاہیں تو اس تلاش میں بڑی ناکامی ہوگی
قدیم تاریخین زیادہ تر دراصل بادشاہوں کی سوانح بیان ہیں، جنہیں خصوصیت کے ساتھ ان کے فتوحات ملکی اور
ادریگی کارنامے جو اس زمانہ کے سب سے زیادہ قابل توجہ واقعات تھے تفصیل و مبسوط کے ساتھ مذکور
ہوتے ہیں، اس بنا پر تاریخ کے صفحات بھی میدان کارزار بن گئے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ تلواروں کی جھنکار، طبل و
بوق کی گونج، اور صغیر جنگ کے غوغائے رستخیز میں درس تعلیم کی کمزور آوازیں کیونکر سنائی دے سکتی ہیں؟
تاہم اگر تاریخی صفحات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں بادشاہوں کے حالات زندگی کے
ضمن میں دوسری قسم کے واقعات بھی ملتے ہیں، اگر کوئی شخص محنت اور جستجو سے کام لے تو گذشتہ زمانہ کی
سیاست، نظم حکومت، طریق عدل و انصاف، تہذیب، تمدن اور دیگر ضروری حالات کا اندازہ لگانے کے لئے
منتشر طور پر اسکو کافی واقعات مل سکتے ہیں اس رسالہ میں اپنی اسی قسم کی تلاش و جستجو کے نتائج پیش کرنا
چاہتا ہوں جنکا تعلق محض ہندوستان کے علمی و تعلیمی معاملات سے ہے۔

اس سے پہلے کہ اصل مضمون پر سلسلہ سخن شروع کیا جائے، چند ایسے اجمالی امور کی تشریح و توضیح
کر دینا مناسب ہے، جن سے یہ معلوم ہو کہ قدیم فارسی تاریخوں میں ہندوستان کے گذشتہ مدارس کے
متعلق کیوں تھوڑی ابواب نہیں ملتے، نیز وہ عمارات و اماکن کون تھے جن سے تعلیم گاہوں کے کام لے
جاتے تھے۔

(۱) مسلمان اپنے مذہبی مذاق کی بنا پر ہمیشہ تعلیم و تعلیم اور درس و تدریس کو مذہبی و دینی مشغلہ اور کاروبار خیال کرتے رہے ہیں، وہ طلباء کی امداد و تعلیم کی اشاعت، مکتب و اسباب درس و تعلیم کا وقفہ، مدارس بنانا، مدرسے، علماء کی خدمت و اعانت وغیرہ کو ایک مذہبی حکم اور برکت و فلاح دین کا باعث سمجھتے رہے۔ اس بنا پر یہ چیز بھی انکے اور ضروریات زندگی کی طرح انکی زندگی کا لازمی و ضروری جز و پوچھی گئی۔ ایک شخص کے روزمرہ اعمال زندگی اسکی تلخیص حیات میں خاص طور پر اہمیت کے ساتھ قابل ذکر کیے جاتے تھے بلکہ عام الفاظ میں دوسری ضروریات زندگی کے ساتھ سرسری طور پر مذکور ہوتے ہیں۔ قدیم ایام میں مسلمانوں نے تعلیمی سلسلہ میں جو کچھ کارہائے نمایان کئے ہیں، انکو قدیم مورخین مخصوص اور تفصیل میں بیان کرتے۔

(۲) ہر شخص نے فارسی تاریخوں میں سلاطین اسلام کے اعمال زندگی میں عموماً یہ الفاظ پڑھے ہوں گے ”در عہد حکومت خود تالابہا و چاہا و پٹھا بستند و در ہر طرف و لیکر عمارات و بقاع خیر نیز بنانادند“ ایسی عبارتوں میں عموماً عمارات و بقاع خیر سے مراد مدرسے، مکتب، مسجدیں اور خانقاہیں ہیں۔ (۳) جیسا کہ آئندہ تفصیلاً معلوم ہوگا، قدیم زمانہ میں تعلیم کے لئے عموماً علیحدہ عمارتیں بنائیں جوتی تھیں۔ یہ کام مساجد سے لیا جاتا تھا، اس زمانہ کی تمام مسجدیں مدارس کا کام دیتی تھیں، اسلئے ہر قدیم مسجد ایک بڑی درگاہ تھی یہی سبب ہے کہ ہندوستان کے قدیم اسلامی شہروں میں قدم قدم پر مسجدیں چوٹی مسجدیں ملیں گی، دلی، آگرہ، لاہور، جوپور، بیجاپور، احمد آباد، گجرات، وغیرہ قدیم اسلامی دارالسلطنت میں جو عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں اور جو اب تک باقی ہیں، انکی ہیئت کنائی صاف بتاتی ہے کہ ان بڑا حصہ تعلیم گاہوں کے کام میں آتا تھا، ان مسجدوں میں اب تک تھکوتھن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حجرہوں کا وسیع سلسلہ نظر آئے گا، یہ درحقیقت طلبہ اور مدرسین کے رہنے کے مقامات تھے اور انہیں سے بعض اب تک اسی کام میں ہیں۔ (۴) قدیم خانقاہیں بھی عموماً تعلیم گاہوں کے فرائض ادا کرتی تھیں، متصوفین اور گوشہ نشین مشائخ

اسوقت صرف مجاہدہ نفس و وظائف ہی کو عبادت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ عادیہ مقبول و منقول اور ظاہر و باطن دونوں کی تعلیم و تدریس اپنا حقیقی نصب العین خیال کرتے تھے۔ قدیم مشائخ و بزرگان دین کے حالات میں درس و تدریس کا شغل عموماً نظر آتا ہے، ہر خانقاہ میں تشنہ لبان تصوف و علوم باطن کی طرح طالبین علوم ظاہر کی جماعت کثیر بھی پائی جاتی تھی، خانقاہوں کے لئے حکومت کی طرف سے جو عطیے یا شخصی اوقاف ہوتے تھے، انکا بڑا حصہ طلباء پر صرف ہوتا تھا، اس بنا پر قدیم خانقاہوں کو بھی مدارس و مکتب کے سلسلہ میں شمار کرنا چاہیئے۔

(۵) سلاطین اور بزرگان کرام کی قبروں پر جو مقبرے اور روضے تعمیر ہوتے تھے، انکے ساتھ اندر گروہ بہت سے حجرے اور کمرے اسی غرض سے تعمیر ہوتے تھے کہ وہ مدرسوں کے کام میں آئیں، چنانچہ مقبرہ علاء الدین خلجی اور مقبرہ ہمایونی وغیرہ کا ذکر آگے آتا ہے، اسوقت بھی جو قدیم مقبرے دلی، آگرہ، احمد آباد، بیجاپور وغیرہ میں قائم ہیں، انکی ہیئت خود انکی تاریخ کو بتا رہی ہے۔ ان اجمالی اشارات کے بعد ان مخصوص عمارات کا ذکر کیا جاتا ہے، جو اس سلسلہ سے الگ خاص مدارس کے نام سے تعمیر ہوئے، یہ معلومات مختلف کتابوں کے مشترک و پرکندہ بیانات فراہم کئے گئے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

گو ہندوستان میں مسلمانوں کا داخلہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہوا، لیکن یہ داخلہ پورے ملک ہند پر موثر نہ تھا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ظلمت کدہ ہند کے بعض اطراف میں نور اسلام کی شعلیں اسی زمانہ میں پڑیں، لیکن صحیح معنی میں اسلامی حکومت کے قدم سرزمین ہند میں سلطان محمود غزنوی کی مجاہدانہ مساعی کی بدولت جمے، اور اسلئے اسی وقت سے اسلامی حکومت کا آغاز سمجھنا چاہیئے، سلطان محمود کی توجہ فتح ہند کی طرف سن ۳۸۵ھ سے ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کا بیشتر مغربی حصہ اسلامی پرچم کے نیچے آگیا، اسلامی فتوحات کی یہ عام خصوصیت ہے کہ پہلے بے شبہ تیغ و تبر سے کام لینے والی

جس قسم فرشتہ لکھتا ہے۔

”و بمقتضا من الناس على دين ملوكهم هر يك از امراء و اعيان دولت به بنائے مسجد و مدارس

در باطات و خانات مبادرت نمودند۔“

پس ایسے عہد حکومت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہندوستان تعلیمی ذرائع و اسباب سے خالی ہوگا، بلکہ

جب برستا ہے تو دشت و چین و دونوں کو یکساں سیراب کرتا ہے۔

میں اس سے ایک اور نتیجہ تک پہنچنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اسلامی عہد حکومت میں جیسا کہ تفصیلاً آگے

معلوم ہوگا، مساجد کے پہلو بہ پہلو مدارس و مکاتب کے قیام کا عام مذاق پیدا ہو گیا تھا، میرے خیال میں

اس کا ذریعہ بھی عہد محمودی ہی تھا، یعنی سلطان محمود اور اسکے امراء کے توسط سے ابتداءً یہ طریقہ ہندوستان میں

داخل ہوا اور بعد کو رفتہ رفتہ عام طور پر رواج پا گیا۔

سلطان محمود کے بعد اس کا دوسرا شاہ کا شہاب الدین مسعود تخت نشین حکومت ہوا، یہ علماء کا مربی

اور علم پرور بادشاہ تھا، اس کی علمی فیاضیاں بہت بڑھی ہوئی تھیں، اکثر علماء نے اسکے نام سے کتابیں لکھیں،

قاضی ابو محمد ناصحی نے فقہ مسعودی کے نام سے ایک کتاب فقہ احناف میں لکھی اور اسکے نام سے منسوب کی،

ابو ریحان خوارزمی نجم جو ریاضیات میں بے نظیر تھا، اس نے قانون مسعودی لکھ کر جو انعام پایا اسکے

متعلق فرشتہ لکھتا ہے۔

”ابو ریحان خوارزمی نجم کہ علامہ وقت بود در ریاضیات نظیرے نداشت، قانون مسعودی

در علم ریاضی بنام نامی او نوشت و فیلے از نقرہ صلہ یافت۔“

اس نے اپنے حدود حکومت میں کثرت مدارس قائم کئے، فرشتہ لکھتا ہے۔

”در اواکل سلطنت او در ممالک محروسہ چندان مدارس و مساجد بنیاد نهادند کہ زبان از تعداد

آن عاجز و قاصر است۔“

فوجیں بڑھتی ہیں، لیکن فتح کے بعد وہ تلوار ہمیشہ اُنکے ہاتھوں میں رہتی، بلکہ اس دامان ہاتھوں میں ہی ان کے ہاتھوں میں کتاب و قلم نظر آتے ہیں، جسکے رشحات فیض سے وہ سارے ملک میں علم و فضل کا دریا بہا دیتے ہیں،

ابوالعزم سلطان محمود کا دار السلطنت غزنی تھا، ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کا مرکز و محور

موجودہ زمانہ کی صوبہ جاتی حکومت کے اصول پر تھا، جہاں اسکے امراء جنکو اس زمانہ کے لفٹننٹ گورنر

کہیے نظم و نسق کرتے تھے، اس قدیم زمانہ کی نسبت اگرچہ تصریح کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس دور

ہندوستان کی تعلیم کے لئے اسلامی حکومت نے کیا انتظام کیا تھا، تاہم اتنا معلوم ہے کہ سلطان

عبد دست اور عالم پرست بادشاہ تھا، اس کا دربار علماء و حکماء اور شعراء کا مرجع و ماویٰ تھا، اسکو اپنے

حدود حکومت میں مدارس و مساجد کے قیام کا بید شوق تھا، ششہ کے بعد جب سلطان محمود

قنوج سے کامیاب غزنی واپس آیا ہے تو اس نے جامع مسجد اور مدرسہ کی بنیاد رکھی، چنانچہ

لکھتا ہے:-

”سلطان چون فتح فیروزی این سفر مراجعت نمود، فرمود، تا در غزنی مسجد جامع بنیاد نهادند

و صہل عمارت مسجد از سنگ مرمر و خام مرصع و سدس و دشمن و مدور بر آوردند بطرزیکہ بنیدگان

از مسانت و طراحی آن تعمیر شدند و بعد از اتمام عمارت بموجب حکم بنوع آنرا بانواع زمینت فروش

و قذیل مزین ساختند کہ ظرفای وقت آن مسجد را عروس فلک می گفتند، اور جو ارکان مسجد

مدرسہ بنا نهادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ و ہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف

نمودند۔“ (فرشتہ جلد اول حالات محمود غزنوی)

بادشاہ کا یہ مذاق دیکھ کر اسکے امراء و اعیان دولت بھی اسکی پیروی کرتے تھے جسکی بدولت

ہر شخص سچے سچا ہو سکتا ہے کہ اسکے حدود حکومت میں تعلیم کی کتنی گرم باندی ہوگی، چنانچہ بیان مابقی سے

پورے پونے دو سو برس کی حکومت کے بعد خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی کی شکست پر
شہر میں بمقام لاہور امیر شہاب الدین محمد غوری کے مقابلہ میں نصیب ہوئی، حکومت ہندوستان
غزنوی سے خاندان غوری میں منتقل ہو گئی

مدارس اجمیر

شہر میں شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر کو فتح کیا ہے، مصنف تاج المآثر (حسن نظام
نیشاپوری) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر میں متعدد مدرسے قائم کیے
ان مدارس کی تاریخ بنا صحیح طور پر متعین نہیں، لیکن سندھ کو رکے بعد قریب ہی قریب میں ہو گئی، اس بنا
پر مدرسے ہندوستان کے قدیم ترین مدارس میں ہیں،

مدارس دہلی

اس وقت تک ہندوستان کے شاہنشاہی تعلقات غزنوی کے ساتھ تھے شہاب الدین غوری
بعد قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۰ء میں لاہور کے بجائے دہلی کو ہند کا دار السلطنت قرار دیا، قطب الدین
جافین شمس الدین التمش شہر میں تخت نشین ہوا، اس بادشاہ نے خاص دار السلطنت دہلی میں
مدارس قائم کئے، گو تعین دقیقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا لیکن قرینہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دہلی کا مشہور
و معروف مدرسہ معری اسی علم پر درباد شاہ کے عہد حکومت کی یادگار ہے، کیونکہ بدایون میں بھی شمس
التمش نے اپنے ایام امارت میں ایک مسجد اور اسکے متصل معری نامی مدرسہ قائم کیا تھا، قرینہ یہ ہے
اُس نے یہ مدارس اپنے آقاے ولی نعمت شہاب الدین غوری، جس کا اصلی نام معری الدین محمد غوری
کے نام پر قائم کئے تھے، سلطانہ رضیہ بنت شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں جب قرامطہ نے دہلی
پرورش کی تھی تو حسب بیان مصنف طبقات ناصری وہ اس مدرسہ کے قریب تک گھس آئے تھے،
۱۰۵ یہ ہندوستان کی سب سے قدیم فارسی تاریخ ہے، اسکا ایک نقلی نسخہ حیدر آباد دکن کے لکھنؤ خانہ مصفیہ میں ہے

زمانہ ۶۳۵ھ تھا، مدرسہ معری دہلی کے ایک مدرس مولانا بدر الدین اسحاق بخاری تھے جو معقول منقول
میں اپنے وقت کے سرآمد درگزر تھے۔
اس عہد کے بعد دہلی میں ایک اور عظیم الشان مدرسہ کا پتہ چلتا ہے، جس کا نام مدرسہ ناصریہ تھا،
یہ مدرسہ ناصر الدین الدین شہزادہ محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے نام پر قائم کیا گیا، طبقات ناصری
مصنف سراج الدین عقیف اس مدرسہ کے مہتمم اور نگراں تھے، مصنف نے یہ کتاب بھی اسی شہزادہ کے
نام پر لکھی تھی،

مدارس مقبرہ علاء الدین خلجی یہ مدرسہ مسجد قوت الاسلام اور قطب صاحب کی لائٹ کے متصل واقع تھا
شاہ جہاں علاء الدین خلجی کا انتقال ہوا، اسکے بعد سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے غالباً
شاہ جہاں میں یہ مقبرہ بنوایا، مقبرہ مدرسہ اور مسجد سب کی مرمت فیروز شاہ نے اپنے عہد حکومت میں کی
صندل کے چپر کٹ چڑھائے، صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مدرسہ کب قائم ہوا، اگر قطب الدین مبارک شاہ
نے مقبرہ علائی کے ساتھ بنوایا تو اسکا سنہ بنائش ہوگا، اور اگر مسجد قوت الاسلام کے ساتھ اسکی بنیاد
پڑی تو سنہ ۷۰۰ھ تاریخ بنا ہوگی، کیونکہ اسی سال قطب الدین ایبک نے اس مسجد کی بنیاد ڈالی تھی، پھر ۷۲۰ھ
میں سلطان شمس الدین التمش نے بھی اس مسجد پر تین تین محرابوں کا اضافہ کیا، اور اصل لائٹ پر بھی پانچ
درجے زیادہ کئے، ممکن ہے کہ مدرسہ کی بنیاد اسی سلسلہ تعمیرات میں پڑی ہو، اسلئے ٹھیک تاریخ بنا
نہیں بتائی جاسکتی، میرے خیال میں دوم اور سوم عہد کو ترجیح ہے، عہد اول میں صرف مقبرہ کی تعمیر ہوئی۔

دہلی میں ایک مدرسہ حوض خاص مشہور مدرسہ تھا، حوض دراصل سلطان خلجی کا بنوایا ہوا تھا
اس نے اپنے تخت نشینی کے سال ۷۹۶ھ میں بنوایا تھا، فیروز شاہ کے زمانہ میں یہ حوض مٹی سے بھر گیا تھا
بادشاہ فیروز نے اسکو صاف کرایا، جہاں جہاں مرمت کی ضرورت تھی مرمت کی گئی، اور تقریباً ۸۵۰ھ میں
۱۰۵ فتوحات فیروز شاہی ۱۰۵ ایضاً۔

اسکے اوپر ایک مدرسہ قائم کیا جس میں مشہور مدرسین جمع کئے گئے، اس مدرسہ کے صدر مدرس سید
بن جمال حسینی تھے، انکا انتقال ۹۰۰ھ میں ہوا اور اسی مدرسہ کے صحن میں دفن کئے گئے۔
مدرسہ فیروز شاہی، دہلی کا یہ سب سے مشہور اور اپنے عہد کا بہترین مدرسہ تھا، فیروز شاہ
مدرسہ فیروز آباد دہلی میں ۹۳۰ھ میں قائم کیا تھا، ضیاء برنی نے اسکی تعریف میں صفحے کے صفحے سیار
ہیں لکھا ہے،
”یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبی عمارت، موقع اور حسن انتظام و تعلیم کے لحاظ سے تمام مدارس
ہند میں سب سے بہتر اور عمدہ ہے، مصارف کے لئے شاہی وظائف مقررین“
طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے متصل مسجد بھی تھی، مولانا جلال الدین رومی اس مدرسہ
مدرس دینیات تھے۔

مدرسہ بالابند آب سیری، یہ مدرسہ دراصل ایک شاہی عمارت میں واقع تھا، ضیاء برنی لکھتا ہے
مدرسہ فیروز شاہی کی عمارت سے دہلی کی کوئی عمارت حسن عمارت و موقع میں اگر مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ بھی
بالابند آب سیری کی عمارت ہے، اسکے بعد ضیاء برنی لکھتا ہے۔
”مولانا سید الامامہ العلماء نجم الملتہ الدین سمرقندی کہ از نو اساتذہ است۔ در آن عمارت مبارک
مدرس گشتہ۔“
اسکے لئے کچھ وقف اور شاہی وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا، نیز بہت سے طلباء کی کفالت کی جاتی تھی
وہ استاد مذکور سے فیض تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ماہ صفر ۸۰۰ھ میں سلطان فیروز شاہ نے اپنے بیٹے شہزادہ فتح خان کی وفات پر اسکے مقبرہ
ساتھ ساتھ بطور کار خیر و ایصال ثواب ایک مدرسہ بھی قائم کر دیا جسکے اخراجات کا مدار شاہی وظائف
۱۰ تاج فرشتہ آثار الصنادید۔

ہاویون کا عہد حکومت تقریباً ۹۳۵ھ سے شروع ہوتا ہے، اس نے علوم و فنون کی ترقی میں اگلے
بادشاہوں سے کچھ کم کوشش نہیں کی، ہاویون علوم کا عاشق اور شفیق تھا، علم ہیئت و جغرافیہ سے اسکو خاص
مناہبت تھی، اس نے طبائع عناصر پر ایک خاص رسالہ لکھا تھا، کرسے اور سطرلاب جو عموماً مدارس ہند
میں آج نظر آتے ہیں، یہاں ابتداء انکا رواج دینے والا بھی یہی ہاویون ہے، اس نے خود ایک خاص
تکم کا سطرلاب ایجاد کیا تھا جو اسطرلاب ہاویونی کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ ہمارے دارالعلوم ندوہ
کے بنیادین ایک سطرلاب موجود ہے جسپر صانع کی یہ عبارت کندہ ہے۔
علی ضیاء الدین محمد بن قاسم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہمداد سطرلابی ہمایونی لاہوی فی ۸۰۰ھ
ہاویون نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جسکے ایک مدرس شیخ حسین تھے، لوگوں کو یہ عام طور پر
معلوم نہیں کہ ہمدان کے مقبرہ کے اوپر جو چھت تھی وہ دراصل ایک مدرسہ تھا جس میں بڑے بڑے اساتذہ وقت
تعلیم دیتے تھے، اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلباء کی اقامت کے لئے بنے ہوئے تھے۔
عبدالکبریٰ بن مہتمم بگم نے جو اکبر اعظم کی مرضہ تھیں، ۹۴۹ھ میں پرانے قلعہ کے پاس مغربی
دروازے کے مقابل میں ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا، مدرسہ کا نام خیر المنازل رکھا گیا جسپر یہ کتبہ لکھا ہوا تھا

بدور ان جلال الدین محمد	کہ باشد اکبر شاہان عادل
چو مہتمم بگم عصمت پناہی	بناکرد این بنا بہر افاضل
دلے شد ساعی این نفعہ خیر	شہاب الدین احمد خان ذوق
زہے خیریت این خیر منزل	کہ شد تاج او خیر المنازل

جلوس اکبری کے اٹھدین سال اکبر پر حملہ کرنیکی جو کوششیں کی گئیں وہ اسی کے قرب و جوار کا
واقعہ تھا، گو اب یہ مدرسہ کہنڈر ہے لیکن آج بھی اسکے باقی ماندہ آثار اسکی گذشتہ عظمت و شوکت کو
لے آثار دہلی از شیخ۔

یاد دلاتے ہیں،

شیخ عبدالرحمن محدث دہلوی جو جہانگیر کے عہد میں تھے، اخبار الاخبار میں ایک مدرسہ کا ذکر کرتے ہیں کہ جہانگیر نے تعلیم پانی تھی، اس مدرسہ میں تعلیم کا وقت صبح سے دوپہر تک اور ظہر کے بعد شروع ہوتا تھا، چنانچہ شیخ موصوف روزانہ اپنے گھر سے انہیں اوقات میں مدرسہ جایا کرتے تھے۔

دلی کی جامع مسجد عہد شاہجہانی کی صرف تعمیری یادگار نہیں بلکہ اس سلسلہ میں اوراق بہار میں چند اور رفاه عام کی عمارتیں بھی ہمیشہ یادگار زمانہ رہیں گی، جیسا کہ اسٹیفن نے لکھا ہے، مسجد کے بنیاد پر شاہی شفا خانہ قائم تھا، جہانگیر اور سکینوں کے لئے علاج کے تمام اسباب و سامان میں سے کئے گئے تھے، مفت علاج کیا جاتا تھا، اور وہاں بھی بلا قیمت تقسیم کیجاتی تھیں، مسجد کے جنوبی شاہی مدرسہ تھا اس مدرسہ کا سال بنائینا سنہ ۱۰۲۵ھ عہد شاہجہانی ہے، یہ مدرسہ گردش روزگار

ہاتھوں ۱۰۲۵ھ کے غدر کے بہت پہلے سے ویران پڑا ہوا ہے، اس عظیم الشان مدرسہ کا نام دارالعلوم بہادر شاہ کے عہد حکومت میں ایک نیا مدرسہ دلی میں قائم ہوا، جسکے بانی امیر غازی الدین فیروز جنگ تھے، مرحوم اپنے مدرسہ ہی میں مدفون ہوئے، سال وفات سنہ ۱۰۲۵ھ ہے، امیر غازی نواب آصف جاہ بانی خاندان حیدر آباد کن کے والد بزرگوار تھے، یہ وہ علم پرور خاندان ہے جسکے فیض آج بھی ہندوستان کا گوشہ گوشہ سیراب ہو رہا ہے، امیر غازی الدین اور نگ زیب عالمگیر کے ان مجاہد و معتمد امرا میں تھے جو دربار بہادر شاہی کے بھی معتمد رکن رہے، امیر غازی الدین نے یہ مدرسہ اپنے دروازہ کے قریب قائم کیا تھا، مدرسہ کی عمارت کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، اس مدرسہ کی شکستہ عمارت میں ابھی تک ایک خوبصورت دروازہ باقی ہے جو ایسے مقام پر بیجا تا ہے جسکی ظاہری حالت یہ بتاتی ہے کہ وہ مدرسہ کا سطح تھا،

نواب، عثماد الدولہ فضل علی خان کھنؤ نے اس مدرسہ کے خرچ کے واسطے ایک لاکھ ستر ہزار روپے

انگریزی کمپنی کو دیئے تھے، چنانچہ کمپنی کی طرف سے مقبرہ کی دیوار پر انکے نام کا ایک کتبہ لگایا گیا جسکی عبارت

کتبہ مقبرہ غازی الدین خان

نہ بروج نقشے ماند و لیک جزای عمل ماند و نام نیک

”بیاد حسنات نواب عثماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خان بہادر سہراب جنگ کہ یک لک

دہشتا و ہزار روپیہ برائے ترقی علوم در مدرسہ ہذا واقع دہلی خاص مولد و وطن خویش بصا جان کمپنی

انگریز بہادر تغویض نمودہ اند منقوش گردیدہ سنہ ۱۲۹۰ھ“

محمد شاہ کے عہد حکومت میں نواب شرف الدولہ اداوت خان نے ایک مدرسہ اور اسکے ساتھ

ایک مسجد بنوائی، اس مدرسہ کا سال بنائینا سنہ ۱۱۳۵ھ ہے، مسجد پر یہ کتبہ لگایا ہوا ہے،

در زمان شہ خورشید سریر نخل حق ماہ زمین شاہ زمان

ناصر الدین محمد شاہ است تیغ اذ کفر مشکن در دوران

شرف الدولہ بنا فرمودہ است مسجد و مدرسہ عالی شان

این دو بیت اشرف علم و عمل ہچو سعیدین فلک کردہ قرآن

سال تاسیخ بنا گفت خرد قبلہ حج ارادت کیشان

دلی کا سب سے آخر الذکر لیکن کثیر المنافع مدرسہ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کا ہے، یہ شاہ دلی اللہ

صاحب محدث دہلوی کے پدر بزرگوار اور فتادی عالمگیری کے جامعین میں تھے، یہی مدرسہ تھا جسکے نقوش

میں شاہ دلی اللہ، قاضی شہار اللہ پانی پتی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، شاہ اسمعیل، شاہ اسحاق، شاہ

عبدفادر وغیرہ علماء کرام پل کر جو ان ہوئے اور آخر باری باری سے اسکے مندرس پر شکن ہوئے

یہ دو سہ چتر فیض ہے جہان سے حدیث نبوی کے برکات تمام گوشہ ہائے ہند میں پہلے، اس مدرسہ

کی کٹی ہوئی یادگار اب تک دلی میں باقی ہے۔

(باقی)

موجودہ مشرقی کتب خانے

(۲)

از مولانا عبد السلام ندوی

علمی نمونوں کے کتب خانے | مصر میں بہت سے کتب خانے علمی نمونوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں اہم کتب خانے حسب ذیل ہیں:

کتب خانہ مجمع علم مصر | اس کتب خانے میں ۳۰۰۰۰ کتابیں ہیں، جن میں زیادہ تر فرنیچ، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہیں، اور عربی زبان کی کتابیں کم ہیں، اکثر کتابیں تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، علم اور زراعت و ضاعت کی ہیں،

کتب خانہ جمعیت جغرافیہ خدیوہ | اس میں زیادہ تر فرنیچ زبان میں جغرافیہ بالخصوص افریقہ کے جغرافیہ کی ۵۰۰۰ جلدیں ہیں، اس جمعیت جغرافیہ نے مشرق و مغرب میں جو جغرافیہ تحقیقات کی ہے، اس کا مفصل رپورٹ بھی موجود ہے، اور ایک قابل قدر حیر خیال کی جاتی ہے،

سرکاری دفاتر کے کتب خانے | مصر کا کوئی محکمہ کتب خانے سے خالی نہیں، لیکن اکثر کتابیں وہ ہیں جو سرکاری امور سے تعلق رکھتی ہیں، البتہ بعض کتب خانوں میں علوم و فنون کی کتابیں بھی ہیں،

محکمہ نظارتِ نانوہ کا کتب خانہ | پبلک ورکس کے دفتر میں یہ کتب خانہ قائم ہے، اس میں انگریزی، فرنیچ

عربی زبان کی ۳۰۰۰ کتابیں ہیں، جو زیادہ تر اس محکمہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، ۲۵۰ سرکاری رپورٹیں، اور آٹا عربیہ اور ہندیہ کی کتابیں ہیں، ۳۲۰ کتابیں جیالوجی، میکانک، اور کائنات سے تعلق ہیں، ۵۰ آبپاشی پر ہیں، ۳۱۰ سفر نامے، اور سرکاری مروجہ شہزادان میں، اور بقیہ کتابیں

فن تعمیر اور ہندسہ وغیرہ کی ہیں،

محکمہ جنگ کا کتب خانہ | اس میں فرنیچ، انگریزی، عربی، آلمین، اور جرمن زبان کی تقریباً ۵۰۰۰ کتابیں ہیں، بنو مصر، سوڈان اور ان کے قرب و جوار کے ملکوں کی تاریخ، جغرافیہ، اور اقتصاد سیاسی سے تعلق رکھتی ہیں،

اسکندریہ کے کتب خانے | بطریقہ ہی کے زمانہ سے اسکندریہ خاص طور پر اپنے مشہور کتب خانے کی وجہ سے مشہور ہے، لیکن یہ کتب خانہ بار بار کی آتشزدگی سے برباد ہو گیا، اور اب اس کا عین واثرباقی نہیں، تن اسلامی نے بھی اپنے عہد عروج میں اس کا تلافی نہیں کی، کیونکہ خلفاء و سلاطین نے جو عظیم نشان کتب خانے قائم کئے وہ قاہرہ میں کئے جو اس کا دار السلطنت و مستقر حکومت تھا، جدید دور میں جو نئے پبلک کتب خانے قائم ہوئے وہ سب عادت قدیمہ قاہرہ میں ہوئے، اور اسکندریہ ۱۹۹۲ء تک اس فخر سے محروم رہا،

میونسپلٹی کا کتب خانہ | لیکن جولائی ۱۹۹۲ء میں ممبران میونسپلٹی نے ایک پبلک کتب خانہ قائم کیا اور یورپین کتابوں کا ہتھم سوئٹزر لینڈ کے ایک شخص کو، اور عربی کتابوں کا ہتھم شیخ احمد ابو علی الازہری کو مقرر کیا یہ کتب خانہ ابتدا میں اسکندریہ کے میونسپلٹی کی عمارت میں تھا، پھر خود میونسپلٹی کی عمارت میں منتقل ہو گیا، وقت اس میں یورپین زبانوں کی صرف چند کتابیں تھیں، لیکن شیخ احمد نے عربی کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہا، میونسپلٹی کے چیرمین، یوسف شکور باشا نے ان سے اتفاق کیا، اور خود سلطنت کے متعلق سلسلہ جنابانی کی جب کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود سلطنت نے ۱۳۰۰ عربی کتابیں مطبع بولاق کی مطبعہ کتب خانے کو ہدیہ دیں، یہ پہلا دن تھا کہ کتب خانے میں عربی زبان کی شاخ قائم ہوئی، اسکے بعد یورپین اور عربی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا، اور ان کی تعداد ۱۹۹۳ء تک پہنچ گئی، جن میں ۵۰۰ کتابیں عربی کی اور ۱۴۰۰ کتابیں یورپین زبانوں کی ہیں، یہ کتب خانہ، کتب خانہ خدیوہ کی طرح ہمیشہ پبلک کیلئے

کمل رہتا ہے، اور سمجھن بہت سی نادر کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے،

کتبخانہ عباسیہ | اس کتب خانے کی بنیاد اس طرح قائم ہوئی کہ اسیان اسکندریہ میں حاج علی شاکر پاس بہت سی کتابیں تھیں، جنکو انھوں نے فروخت کرنا چاہا، لیکن شیخ عبدالفتاح نے انکو دیا کہ وہ انکو وقف کر کے سید ابی العباس مرسی کی یادگار میں ایک کتب خانہ قائم کر دیں، انھوں نے اس راے سے اتفاق کیا، اور شیخ عبدالفتاح اور محمد آفندی توفیق نے بھی بہت سی کتابیں

جنکو سید ابی العباس مرسی میں کتب خانے کی شکل میں جمع کیا گیا، اسکے بعد جب علمائے اسکندریہ اپنا اجتماعی نظام قائم کیا تو اس کتب خانہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اسکو بہت کچھ وسعت دی

بہت سے لوگوں نے اس کتب خانہ کی اعانت کی، اب اس میں مختلف علوم وفنون کی ۵۵۵ کتابیں تصبات اور دیات کتب خانے | اسکندریہ اور مصر کے تصبات اور دیات کی مساجد میں اگرچہ

کتب خانے قائم ہیں، لیکن ان میں صرف طنطا کا کتب خانہ احمدیہ قابل ذکر ہے، اس کتب خانے کو

ابراہیم انطاہری شیخ جامع احمدی نے ۱۹۹۰ء میں قائم کیا، اور اسکا ایک خاص مہتمم مقرر کیا

کتب خانہ بن چہ ہزار جلدیں ہیں، جن میں ۳۰۰ قلمی ہیں، اور بعض نادر کتابیں بھی ہیں،

کتب خانہ خلیل آغا | یہ کتب خانہ درحقیقت کتب خانہ احمدیہ کا ضمیمہ ہے، جسکو خلیل آغا نے وقف کیا

اس میں ۳۰۰ کتابیں ہیں اور اکثر قلمی ہیں،

مصر کے پرائیوٹ کتب خانے | تمدن اسلام کے عہد عروج میں مصر میں پرائیوٹ کتب خانے بہ کثرت

کیونکہ کوئی مصنف ایسا نہ تھا جو اپنی ضروریات کے لئے کتابوں کا سرمایہ نہ رکھتا ہو، یہ کتابیں

جب انکے ہاتھ آتی تھیں تو یہ لوگ ان پر اپنا نام بقید تاریخ لکھ دیتے تھے، ان کتابوں پر

۱۔ اصل میں ان کتابوں کی فہرست بھی دی ہے، اور دوسرے کتب خانوں کی نادر کتب کا نام بھی لکھا ہے

بخلاف قبطی، مگر چھوڑ دیا ہے۔

اور حاشیے چڑھاتے تھے، اور جب انکا انتقال ہو جاتا تھا تو انکا کتب خانہ یا تو فروخت ہو جاتا تھا یا انکے

ورثہ میں تقسیم ہو جاتا تھا، اس طرح ایک شخص کا علمی سرمایہ جیسوں آدمیوں کے قبضہ میں چلا جاتا تھا، اس قسم کے شاہیر کی قدیم کتابیں جن پر انکے ہاتھ کے نوٹ اور حاشیے لکھے ہوئے ہوتے تھے انکے

انتساب سے ایک قیمتی یادگار خیال کیجاتی تھیں، اور اب تک بعض پرائیوٹ کتب خانوں میں یہ جواہرات

موجود ہیں،

اس قسم کے چند پرائیوٹ کتب خانے اب صرف قسطنطنیہ میں رہ گئے ہیں، ورنہ اور جتنے پرائیوٹ

کتب خانے ہیں وہ دور جدید کی یادگار ہیں،

گذشتہ صدی کے نصف اول میں کتب خانہ خدیویہ کی تاسیس اور مطبوعات جدیدہ کی کثرت

اشاعت نے جدید علمی گروہ کی توجہ غیر معمولی طور پر اس طرف مبذول کر دی، اسلئے بکثرت پرائیوٹ کتب خانے

قائم ہوئے، ان میں سے اسوقت ہم ان کتب خانوں کا جو کتابوں کی کثرت اور ندرت سے اہمیت خاص

رکھتے ہیں ذکر کرتے ہیں،

خزانہ قدوریہ | یہ کتب خانہ احمد بن اسماعیل بن محمد کی طرف منسوب ہے، انکے والد نے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ

قائم کیا تھا جو انکے انتقال کے بعد برباد ہو گیا، لیکن انکے بیٹے نے یہ کمی پوری کر دی، اور نہایت

سرگرمی اور فیاضی کے ساتھ ۷۰۸ کتابیں جمع کیں، انکو ایک ہال میں مرتب کیا، اور انکی

ایک مفصل فہرست مرتب کی،

اس کتب خانے میں بہت سی قلمی نادر کتابیں ہیں، ۲۷ کتابیں ایسی ہیں جو دسویں صدی ہجری کے

پہلے کی لکھی ہوئی ہیں، بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن پر شاہیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں،

کتب خانہ زکیہ | احمد زکی باشا سکریٹری مجلس وزراء (نظار) مصر کے مشہور علمی آدمی ہیں، یہ کتب خانہ

انہیں کی طرف منسوب ہے، اور اسکو انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے تیس سال کی

مدت میں جمع کیا ہے، اس میں مختلف علوم و فنون کی پانچ ہزار کتابیں ہیں، اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مستشرقین یورپ کی تصنیفات کا بہت بڑا حصہ موجود ہے، مصر، شام، یورپ اور ہندوستان کی مطبوعہ عربی کتابیں بھی بکثرت موجود ہیں، چند نادری نسخے بھی ہیں،

کتبخانہ آصفیہ | یہ کتب خانہ محمد بک آصف بن علی بادشاہ کی طرف منسوب ہے، اور اس میں ۶۰۰۰ قلمی اور مطبوعہ کتابیں ہیں، جن میں ۴۰۰ عربی اور ۲۰۰۰ فرہنج اور ترکی میں ہیں، اس کتب خانہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سو لوہین صدی سے آج تک مستشرقین یورپ نے عربی زبان کی جو کتابیں شائع کی ہیں وہ سب اس کتب خانہ میں موجود ہیں، فرہنج اور ترکی میں زیادہ تر کتابیں مصر، دولت عثمانیہ اور مشرق قریب کے سیاسی اور تمدنی حالات کے متعلق ہیں،

کتبخانہ جلیار دہک | یہ کتب خانہ مصر، شام، اور فلسطین کی تاریخ، جغرافیہ اور سفر ناموں کا بہترین مجموعہ کتابوں کی تعداد ۹۰۰۰ ہے جو اکثر فرہنج میں ہیں، اور بعض عربی، انگریزی، آلمین اور دوسری یورپین زبانوں میں ہیں، فرانس کی مطبوعہ کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ ہے، اور مذاہب مشرق کے متعلق بھی بہت سی کتابیں ہیں،

کتبخانہ احمد بک بھینی | یہ ایک نہایت عمدہ، مرتب اور منتظم کتب خانہ ہے، ہر شخص اس میں جا کر کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہے، اور ہفتہ کے مقررہ دنوں میں نقل لے سکتا ہے، کتابوں کی تعداد ۹۰۰۰ ہے، جس کا اہم حصہ فقہ، قانون، ادب اور تاریخ کے متعلق ہے،

کتبخانہ علی باشا رفاعة | رفاعة باشا طرطردی ایک مشہور شاعر اور ادیب تھے، جنھوں نے ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جو ایک ہزار جلدات پر مشتمل تھا، اور ان میں اکثر قلمی کتابیں تھیں، ان کے بیٹے علی باشا نے اس کتب خانہ میں اور کتابیں شامل کیں، اس میں شمس السائر کا ایک نسخہ خود مولف کے ہاتھ لکھا ہوا ہے، مصر میں ان کے علاوہ اور بھی متعدد پرائیوٹ کتب خانے ہیں جن کی تفصیل علوم نہیں،

قبیلوں کے کتب خانے | قبیلوں کے جو گرجے مصر کے اطراف میں قائم تھے، ان میں متعدد کتب خانے تھے، جو قبطی، یونانی، اور سریانی زبان میں، زیادہ تر مذہبی کتابوں پر مشتمل تھے، ان کے بعد جب قبیلوں نے عربیت اختیار کی تو ان میں عربی کتابوں کا بھی اضافہ ہوا، لیکن قرون مظلمہ میں جب مشرق بالکل خواب غفلت میں سرشار ہو گیا تو یہ گرجے بھی خواب فراموش ہو گئے، تمدن جدید کا ابتدائی زمانہ شروع ہوا اور یورپ نے مشرقی آثار کی جستجو کی، تو اس نے سب سے پہلے اپنی کوششوں کا جولا گاہ انہیں گرجوں کو قرار دیا، اور مشرقی زبانوں میں جو قلمی کتابیں تھیں، ان کو اڑا لیا، اسی طرح مصر میں اور لوگ بھی کتابوں کی جستجو میں آئے اور بہت سی قدیم کتابیں لگے، کیتھولک مذہب کا جو مشن مصر میں تھا وہ کلیسا کی قائم کرنے کے لئے آیا، وہ اپنے ساتھ بہت سی کتابیں لے گیا، جو فائیکان کے میوزیم بورجیا میں موجود ہیں، انگریزی مشنریوں نے بھی ایسا ہی کیا، اور دوسرے لوگوں نے بھی یہی روش اختیار کی، اس طرح جب ان کتابوں کا بہت بڑا حصہ یورپ کے کتب خانوں میں پہنچ گیا تو قبیلوں نے ان کو نہیں کوئین اور پچی کچی کتابوں کو جمع کرنا شروع کیا، اس طرح تقریباً ۲۰۰۰ کتابیں جمع ہو گئیں جو قاہرہ کے دارالخطیر کیہ میں محفوظ ہیں، ان کتابوں میں اکثر قلمی کتابیں ہیں جو قبطی اور عربی زبان میں مذہب کے متعلق ہیں، ان میں بہت سی تاریخی کتابیں ہیں جو کلیسا اور پادریوں کے حالات میں ہیں، اسی طرح کیتھولک قبیلوں کا ایک کتب خانہ ہے، جہاں اکثر مذہبی کتابیں، لیٹن، یونانی اور قبطی زبانوں میں ہیں، اس میں تورات کا ایک نہایت قدیم نسخہ ہے جو مختلف زبانوں میں ہے،

کتبخانہ دیر طبرینا | گرجوں کے کتب خانوں میں ایک قدیم کتب خانہ دیر طبرینا ہے، جہاں مختلف زبانوں میں عیسائیوں کی مذہبی کتابیں محفوظ ہیں، کتابوں کی تعداد ۵۰۰ ہے، جن میں ۷۰ عربی زبان میں ہیں، اکثر قدیم قلمی نسخے ہیں، اس میں انجیل کا ایک نہایت قدیم نمونہ ہے جو عیسائیت کے ابتدائی زمانہ میں سریانی زبان میں لکھا گیا ہے،

اس کتب خانے میں عربی کی قلمی کتابیں قابل ذکر نہیں، لیکن یڈی بکس نے حال میں قرآن مجید، چند آیتوں کا اکتشاف کیا ہے جو پرانے چھڑوں پر لکھی ہوئی ہیں، اس میں عربی کی آیتوں کو منار اور پرسیائی کی تحریر ہے، یڈی موصوفہ کا یہ خیال ہے کہ یہ آیتیں حضرت عثمان کے جمع قرآن کے زمانہ سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں، لیکن اسکا ثبوت مشکل ہے،

شام کے کتب خانے اسلام کے قبل اور اسلام کے بعد شام کتب خانوں کا بہت بڑا مرکز تھا، شام کا کوئی شہر رومی سلطنت کے زمانہ میں مدارس سے خالی نہ تھا، اور ان مدارس میں لازمی طور پر کتب خانے ہوتے تھے، قرون وسطیٰ میں گرجے کتب خانوں اور مدرسوں کا مرکز قرار پائے، اسلام کا دور تو اہل سلاطین، وزراء اور اعیان سلطنت کے محلوں میں بکثرت کتب خانے قائم کئے گئے، اسکے مصر کی طرح شام پر بھی جمالت کی گہٹا چاگئی، اور ان قیمتی یادگاروں کا بچا بچا ذخیرہ صرف گرجوں، مسجدوں اور مدرسوں میں رہ گیا، اہل علم نے جدید دور میں انکے تحفظ میں ہتمام کیا اور اب شام کے مختلف شہروں میں جو کتب خانے موجود ہیں انکی تفصیل حسب ذیل ہے،

دمشق کے کتب خانے تمدن اسلام کے دور ترقی میں دمشق میں بکثرت مدارس و مساجد ہیں اور ان کوئی مسجد اور کوئی مدرسہ کتب خانے سے خالی نہ تھا، لیکن دور مظلمہ میں یہ تمام کتب خانے برباد ہو گئے، سوقت ان قدیم کتب خانوں میں صرف جامع اموی کا کتب خانہ موجود ہے، اس کتب خانہ کا ایک حصہ ۱۸۹۳ء کی علیہ اسلام کی قبر کے پاس اور کچھ حصہ قبة المال میں تھا، لیکن ۱۸۹۳ء میں جب جامع مسجد آگ لگی تو یہ حصہ جل گیا، صرف وہ حصہ جو قبة المال میں تھا بچ گیا، یہ کتب خانہ اب بالکل مفلوج ہے، ایک انگریزی سیاح راجرس نامی کو گزشتہ صدی کے وسط میں اسکے دیکھنے کی اجازت ملی تھی اور غالباً اس نے بعض کتابیں بھی نقل کی ہیں، سب سے اخیر میں ایک مدت تک بیرفان نے پروفیسر برن یونیورسٹی کو اسکے دیکھنے کا موقع ملا، پروفیسر موصوفہ انجیل کے ایک قدیم نسخہ کا

جیوانانی زبان میں تھا، جسکو کرتا تھا، اس غرض سے وہ اس صدی کے اخیر میں دمشق پہنچا، اور اسکو خیال ہوا کہ اسی کتب خانہ میں رومن سلطنت کی بقیہ یادگاروں میں یہ نسخہ اسکو مل سکیگا، اس خیال سے اس نے جرمن گورنمنٹ کے ذریعہ سے اجازت حاصل کرنا چاہی اور صدی کے اخیر میں سلطنت عثمانیہ کی اجازت سے اعیان کی ایک جماعت کے سامنے یہ کتب خانہ کھولا گیا اور پروفیسر موصوفہ نے اس میں مختلف زبانوں کی نہایت قدیم مذہبی کتابیں دیکھیں، اسی طرح تمام مساجد، مدارس اور گرجوں میں بہت سے کتب خانے تھے جو اخیر صدی میں برباد ہو گئے، اور گزشتہ صدی تک بہت کم کتب خانے باقی رہ گئے، بعض عہدہ داران سلطنت نے صدی کے وسط میں ان متفرق کتب خانوں کو ایک کتب خانہ کی صورت میں جمع کرنا چاہا، لیکن یہ تمام زبان ایک مدتی میں پروٹی نہ جاسکیں، صرف مدحت باشاہی الاصلاح نے ۱۸۷۸ء میں اپنے صوبے کے تمام کتب خانوں کو جنکی تعداد دس قلمی ایک جگہ جمع کیا، چنانچہ جب وہ ۱۸۷۸ء میں شام آئے تو علما و شوقیہ کی ایک انجمن قائم کی جسکا مقصد مدارس کا قائم کرنا اور علوم و فنون کو ترقی دینا تھا، اسی سلسلہ میں انھوں نے ان پرانہ کتب خانوں کے جمع کرنا کام اس انجمن کے متعلق کیا، اور اسکے لئے مقام ظاہریہ کو جو ایک ظاہری طرف خوب رہے منتخب کیا، اور ان دس کتب خانوں میں جو کتابیں تھیں انکو ایک جگہ ترتیب دیا، اور انہیں کتب خانوں کی کتابوں سے کتب خانہ ظاہریہ کی بنیاد پڑی،

اس کتب خانے میں قلمی اور مطبوع ۳۵۵۴ کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر فقہ، حدیث، اور علوم اسلامیہ کی ۳۵۰ کتابیں بنت کی، ۳۲۰ تاریخ اور جغرافیہ کی، ۳۵۰ ادب کی ہیں، چند نادری قلمی کتابیں بھی ہیں،

عیسائیوں کے کتب خانے دمشق میں غیر مسلم لوگوں کے بہت سے گریہ، کلیسا، اور مدارس ہیں جنکے ساتھ مذہبی طور پر ایک کتب خانہ بھی ہے، لیکن ۱۸۷۸ء کے واقعات نے انکا بہت بڑا حصہ برباد کر دیا ہے، بسنے

ایک انگریزی سیاح راجرس نامی کو گزشتہ صدی کے وسط میں اسکے دیکھنے کی اجازت ملی تھی اور غالباً اس نے بعض کتابیں بھی نقل کی ہیں، سب سے اخیر میں ایک مدت تک بیرفان نے پروفیسر برن یونیورسٹی کو اسکے دیکھنے کا موقع ملا، پروفیسر موصوفہ انجیل کے ایک قدیم نسخہ کا

بہت سے اور اس میں اکثر عمدہ مطبوعہ کتابیں جمع کی ہیں،

اس سجد کے مشرقی حصہ میں علوم ریاضیہ کا ایک آرٹنا جسکو شجرۃ الافادہ کہتے تھے، اس کے کو
نیل بن عبد اللہ بن علی المتوفی ۸۵۰ھ نے ایک درخت کی شکل میں پتھر پتیل اور لٹے
جس پر پتے میں علوم ریاضیہ میں سے ایک ایک علم کے اصول مندرج تھے اور اسکے ذریعہ
دریافت شدہوں کے طلباء علوم ریاضیہ کے سیکھنے کے لئے آتے تھے،

علی خاندانوں کے برباد شدہ کتب خانوں میں، کتب خانہ بنو ششمہ، کتب خانہ بنو عدیم، اور کتب خانہ بنو خثابہ
میں خاص طور پر فرانس کے ساتھ لیا جاسکتا ہے، بڑے بڑے مدارس، مثلاً مدرسہ سلطانینہ
مدرسہ نصرانیہ، مدرسہ شرقیہ، اور مدرسہ رواجیہ وغیرہ مع اپنے کتب خانوں کے تیورنگ کے
میں برباد ہوئے، اور انکی کتابیں نہایت ارزان قیمت پر فروخت کر دی گئیں، سر دست حلب
میں جو کتب خانے باقی رہ گئے ہیں انکی دو قسمیں ہیں،

۱۔ کتب خانہ اسلامیہ، (۲) اور کتب خانہ نصرانیہ،

اسلامی کتب خانے صرف دو ہیں، ایک کا نام کتب خانہ مدرسہ احمدیہ ہے، پہلے اسمیں ۲۴۹
کتابیں تھیں اور اب یہ تعداد ۳۰۰ تک پہنچ گئی ہے، کتابیں لغت، تاریخ، ادب، فقہ، طب،
تاریخ وغیرہ کی ہیں،

یہ کتب خانہ بالکل پبلک ہے، ہفتے میں دو روز کے لئے کھلتا ہے،

دوسرا اسلامی کتب خانہ ہے جو کتب خانہ عثمانیہ کے نام سے مشہور ہے، اس میں
کثرت عوم و فنون کی ۵۰۰ کتابیں ہیں، اور بعض نادریں، ہفتے میں صرف ایک دن کھلتا ہے
میں شخص آسانی کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہے، انکے علاوہ اور بھی متعدد کتب خانے، مثلاً
کتب خانہ کبیر مولوی، کتب خانہ بنی بازید، کتب خانہ بنی یامیری اور کتب خانہ آل مدرس ہیں،

اب ان میں اہم کتابیں نہیں ہیں، کلدان کے کلیسا میں مطران یوسف داؤد سریانی کا ایک کتب خانہ
جس میں مختلف زبانوں کی مطبوعہ کتابیں ہیں، صاحب کتب خانہ کی زندگی میں یہ کتب خانہ بہت سی کتابیں
شتمل تھا، لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں انکو بعض مدارس، بعض گرجوں،
بعض اجاب کی نذر کر دیا،

مصر میں دمشق کے کتب خانے اکثر کے اس پاس جو مقامات ہوتے ہیں، عربی میں انکو ضوای کہتے
دمشق میں اس قسم کے جو مقامات ہیں، ان میں صیدنا، معلولہ، اور سیرودین تک قدیم کتب خانے
موجود ہیں، صیدنا میں ایک قدیم گرجا ہے، جو حادثات زمانہ کا آماجگاہ رہ چکا ہے، اس میں
کتابوں کا ایک کتب خانہ ہے، جو مختلف اسباب بہت کچھ ضائع ہو چکا ہے،

معلولہ کے کتب خانہ میں عربی اور سریانی زبان کی بہت سی قلمی کتابیں تھیں، جن میں اب بہت
رہ گئی ہیں،

سیرودین ایک پادری کا ایک کتب خانہ تھا جو تادمتر مذہبی کتابوں پر مشتمل تھا، اب اس کتب خانہ
جو کتابیں رہ گئی ہیں، وہ چند ان قابل وقعت نہیں، بہت سی کتابیں خوبانی کتب خانہ کی تصنیف پر
بہت سی کتابیں رومن کیتھولک فرقہ کی تاریخ، اور اس مذہب کے شاہیر کے تراجم و حالات میں ہیں،
حکیم کتب خانے شام کے شہروں میں طلب سب سے زیادہ متدن شہر ہے، قدیم زمانہ میں بہت سے

وادبار اسکی خاک سے اٹھتے تھے، اور سیف الدولہ وغیرہ کی قدردانیوں نے اسکو علم و فن کا مرکز بنا
میان کے سلاطین و علماء نے بہت سے کتب خانے قائم کئے تھے جو بعد میں مختلف اسباب سے
ہو گئے، لیکن میان کے اکثر کتب خانے فقہ و تاریخ کے پر آشوب زمانہ میں برباد ہو گئے، جامع
سب سے بڑے کتب خانہ کو جو ۵۰۰ کتابوں پر مشتمل تھا، ایک ترک فاتح نے برباد کیا، تیورنگ
اسکا رہا سہا نام و نشان بھی مٹا دیا، اتنی مدت کے بعد سنہ ۱۸۵۰ء میں محمود سیاف نے اسکی

شریعت موسوی میں پانچ کتابیں داخل ہیں جن میں چار قسم کے قوانین درج ہیں۔

(۱) سفر خروج باب ۲۰-۲۳ اسکا نام لوگوں نے "کتاب العہد" رکھا ہے۔

(۲) سفر احبار باب ۱۷-۲۶ اسکا نام قانون طہارت ہے۔

(۳) سفر تثینہ،

(۴) شریعت موسوی کا خلاصہ، اور اسکا نام قانون کمانت ہے۔

ان چاروں قوانین میں "قانون کمانت" سب سے اہم ہے، کیونکہ اس میں تقریباً پانچوں کتابوں کی بات آگئی ہے، لیکن اسکی تاریخ تحریر غرا کاہن سے آگے نہیں بڑھتی، جو حضرت مسیح سے صرف ۵۰۰ برس قبل کا قانون طہارت کو مستقل ایک شریعت ہے تاہم وہ کتاب العدد اور کتاب العہد سے بہت ملتا جلتا ہے بعض قرائن سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اسکو خرقیاں بنی نے لکھا تھا، سفر عدد، قانون کی کتاب ہے لیکن اس میں کتابوں کے احکام آگئے ہیں، اب صرف "کتاب العہد" باقی رہ جاتی ہے، جو ان سب سے مقدم ہے، اور سفر خروج باب ۲۰ آیت ۲۲ اور باب ۲۳ آیت ۲۳ میں جبکہ قوانین اور احکام درج ہیں انکے پڑھنے سے صاف ہوتا ہے کہ شریعت حمورابی اور شریعت موسوی میں کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے، اسکی تفصیل ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔

شریعت حمورابی

سفر خروج

جو کوئی کسی مرد کو مارے اور وہ مر جائے تو وہ البتہ قتل کیا جائے، اور اگر اس شخص نے قتل کا قصد نہیں کیا اور خدا نے اسے ہاتھ میں اسے گرفتار کر دیا تو میں تیرے ایک جگہ سزاؤں لگا کر جہنم میں دھکے دوں گا۔

(باب ۲۱ آیت ۱۲ و ۱۳) (دفعہ ۲۰۶ و ۲۰۷) اور اگر کسی نے کسی کو مارا اور وہ مر جائے تو وہ اسکا عاوضہ ۱۰ اشاقل چاندی ادا کرے۔

اور جو اپنے باپ یا اپنی ماں کو مارے البتہ مار ڈالا جائے (آیت ۱۵)

اور وہ جو آدمی کو چرالیجائے اور اسے بیچ دے یا وہ اسے پاس سے پکڑ جائے تو وہ البتہ مار ڈالا جائیگا (آیت ۱۶)

اور وہ جو اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے، البتہ مار ڈالا جائے، (آیت ۱۷)

جب دو آدمی جھگڑیں اور دونوں میں سے ایک دوسرے کو زخمی کر دے تو مارنے والا قسم کھائے کہ اُس نے زخمی کر دیا اور وہ نہیں کیا تھا اور اسکا طبیب سے علاج کرائے۔

اور اگر دو شخص جھگڑیں اور ایک دوسرے کو چھریاں مارے اور وہ نہ مرے پرستری (صاحب نراش) ہو جائے تو اگر وہ اٹھ کھڑا ہو اور لاٹھی لیکے راہ چلے تو وہ جس نے مارا ہے الزام ہے اور فقط اسکے کاروبار کا جو نقصان ہوا ہو سو بھر دے اور اسے بالکل چنگا کر دے، (آیت ۱۸ و ۱۹)

اور اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھیاں مارے اور وہ مار کھاتی ہوئی مر جائے تو اسے سزا دی جائے لیکن اگر وہ ایک دن یا دو دن جیے تو اسے سزا نہ دی جائے کہ وہ اسکا مال ہے۔ (آیت ۲۰ و ۲۱)

اور اگر کوئی کسی آزاد شخص کی بیٹی کو مارے اور اسکا محل اگر لوگ جھگڑیں اور کسی بیٹ والی کو دیکھ بیچائیں ایسا کر اسکا بیٹ کر جائے پر وہ خود ہلاک ہو تو اسے جیل کی سزا

دے دی جائے، (دفعہ ۱۹۵)

جب ایک آدمی جھگڑیں اور دونوں میں سے ایک دوسرے کو زخمی کر دے تو مارنے والا قسم کھائے کہ اُس نے زخمی کر دیا اور وہ نہیں کیا تھا اور اسکا طبیب سے علاج کرائے۔

اور اگر کوئی کسی آزاد شخص کی بیٹی کو مارے اور اسکا محل اگر لوگ جھگڑیں اور کسی بیٹ والی کو دیکھ بیچائیں ایسا کر اسکا بیٹ کر جائے پر وہ خود ہلاک ہو تو اسے جیل کی سزا

دے دی جائے، (دفعہ ۲۰۶ و ۲۰۷)

اس کا شوہر تجویز کرے دیجائے، اور وہ قاضیوں کی تجویز کے
موافق گنہگاری دے، اور اگر وہ اس صدمہ سے ہلاک
ہو جائے تو تو جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے
آنکھ، دانت کے بدلے دانت، اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ
پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا زخم کے
بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔ (آیت ۲۵ تا ۲۷)

اور اگر مر جائے تو اس شخص کی مٹی قتل کی جائے اور اگر مر جائے
موتی سین سے ہو تو مارنے والا پانچ شاقل دے اور اگر مر جائے
وہ مر جائے تو نصف من چاندی ادا کرے اور اگر مر جائے
ننڈی ہو اور اسکا پیٹ گر جائے تو مارنے والا دو شاقل دے
چاندی دے اور اگر مر جائے تو ایک من کی تہائی چاندی
ادا کرے اور جب کوئی شخص اپنے برابر درجہ کے شخص
وانت اکھیرے تو اسکا و انت بھی اکھیر لیا جائے۔

(۲۱۴۲۹۰۰۰)

اگر کوئی شخص کسی غلام کی آنکھ پھوڑ دے یا اس کی
توڑ ڈالے تو اس کی نصف قیمت ادا کرے۔

(وفی ۱۹۹)

کر دے، اور اگر کوئی اپنے غلام یا اپنی نوٹھی کا دانت توڑی
تو اس کے دانت کے بدلے میں اُسے آزا کر دے،

(آیت ۲۶ و ۲۷)

اگر بیل مرد یا عورت کو سینگ مارے ایسا کہ وہ ہلاک
ہو تو وہ بیل پتھر و ن سے مارا جائے اور اس کا گوشت کھایا
نہ جائے اور بیل کو مالک بیگناہ ہے (آیت ۲۸)

جب کوئی بے عقل (دیوانہ) بیل کسی آدمی کو مرگ
مار کر قتل کر ڈالے تو یہ ایسا واقعہ ہوگا کہ اسکی کوئی سزا نہیں
(دفعہ ۲۵۰)

(وقفہ ۲۵۰)

اور لکھ بیل کا مالک جانتا تھا کہ میرا بیل سینگ کا
دو پھر بھی اُس نے اُسکے سینگ بنین توڑے اور نہ

پر اگر وہ بیل آگے (پہلے) سے مینگ مارنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کے مالک کو خبر دیکھی اور اس نے اس سے باندھ کر کہا

۱۵ آزاد اور غلاموں کے مین مین ایک طبقہ کا نام ہے۔

اور اس نے مرد یا عورت کو ہلاک کیا، تو بیل پر چھڑاؤ کیا جائے اور اسکا مالک بھی مارا جائے اور اگر اس سے خون بہا غلام ہو تو یہ من کا تہائی حصہ دے۔

(دفعہ ۲۵۱ و ۲۵۲)

وہر اجاے سو پرادے خواہ اس نے بیٹا مارا ہو خواہ بیٹی
اس حکم کے موافق اُسکے ساتھ عمل کیا جائے، اگر بیل کسی
غلام یا لونڈی کو سینگ مار بھیجے تو وہ اُنکے مالک کو متعال کے
وزن کے ۳۰ روپے دے اور بیل پھر اُسے مارا جائے۔

(آیت ۲۹ تا ۳۲)

اور اگر کوئی بیل یا بھیر چرایے اور اسے فوج کرے
یا بیچے تو وہ ایک بیل کے پانچ بیل اور ایک بھیر کی
چار بھیر میں دے۔

(باب ۲۲ آیت ۱)

جب... انسان یا بیل یا... (اصل پتھر پر لکھا ہے)
جب کوئی شخص بیل یا بکری یا گدہ یا سور یا خدائون یا
محل کی کشتی کو چھالے تو اسکا سگنا معاوضہ ادا کرے اور
اگر وہ مالی مین سے ہے تو اگنادے اور اگر ادا نہ کر سکے
تو قتل کیا جائے۔ (صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳)

جب کوئی کسی کے گھر میں نقب لگائے تو اسکو نقب کے
پاس قتل کر کے وہیں گاڑ دینا چاہیے۔
(دفعہ ۲۱)

(دفتره ۲۱)

یہ دن کو بتوا سکے لئے خون کیا جائیگا چاہیے کہ وہ پورا
بدلوں سے اگر وہ کنگال ہو تو چوری کے لئے بیجا جائے
(آیت ۲۷)

(آیت ۳۰ و ۳۱)

اگر کوئی اپنی بکریاں کسی کے زمین میں چیرے اور اُس کے

اگر کوئی کمیت یا پاکستان کھلاے (کھلوائے) اور

اپنے چار بایے امین چھوڑے اور دوسرے کے میدان میں
چراغے تو اپنا اپنے اچھا بکیت اور بہتر سے بہتر انگریز باغ
اسکے بدلے دے، (آیت ۵)

اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو نقد یا جنس رکھنے کو سوئے
اور اس شخص کے گھر سے چوری جائے تو جب وہ چور ہاتھ
لگے تو دونوں بھروسے۔

(آیت ۷)

اگر چور پکڑا نہ جائے تو اس گھر کا مالک قاضیوں کے
آگے لایا جائے تاکہ معلوم ہو کہ اُس نے اپنے ہمسایہ کے
مال پر ہاتھ بڑھایا یا کہ نہیں؟

(آیت ۸)

سب قسم کی خیانت میں خواہ بیل کی خواہ گدھے یا
بھیڑیا کیڑے کی یا کسی چیز کی جو گم ہوئی ہو جبکہ کوئی دعویٰ
کرتا ہے کہ میرا ہے دونوں طرف والوں کا جھگڑا قاضیوں کے
حضور لایا جائے اور قاضی جسے مجرم کرے وہ اپنے ہمسایہ کو
دونا دے،

(آیت ۹)

مالک کو اطلاع نہ کی ہو تو بکیت کاٹ دیا جائے
چرانے والے سے ۲۰ جوڑ (ایک پیانہ کا نام ہے) دے
(ایک مساحت کا نام) وصول کیا جائے، (دفعہ ۱۰۷)
اگر کوئی اپنا اسباب کسی دوسرے گھر میں رکھ لے
وہ کچھ یا سب چیزیں یا اور کسی طریقے سے گم ہو جائے
تو گھر والے کو گم شدہ مال ادا کرنا اور چوروں سے چوری

مطالبہ کرنا چاہیئے۔ (دفعہ ۱۲۵)

جب کوئی شخص اپنے گھوڑوں دوسرے شخص کے گھر
میں رکھا دے اور وہاں سے ضائع یا گم ہو جائیں تو
قاضی کے روبرو اپنے گھوڑوں طلب کرے اور کہلیا
اُسکو ادا کریگا۔ (دفعہ ۱۲۰)

اگر کسی نے کوئی چیز ضائع کر دی پھر اُسکو دوسرا
پاس پایا اور وہ اقرار کرتا ہے کہ اُس نے چند بڑبڑوں
موجودگی میں اُسکو خرید لیا ہے، اور مالک کہتا ہے کہ میں نے
کے ثبوت میں گواہ پیش کر سکتا ہوں تو خریدار کے ذمہ
کہ بائع ان بڑبڑوں کو جو بیع کے وقت موجود تھے (معاذ اللہ)

حاضر کرے، اور مالک کو بھی اس وقت موجود رہنا چاہیے
تاکہ قاضی سب کی دہلیوں پر غور کر سکے، اگر بڑبڑے
قاضی کے سامنے دونوں کو سچا کہیں تو بائع چور سمجھا جائے

اور قتل کیا جائیگا اور مالک کو اسکی چیز دیدہ جائیگی اور
خریدار کو بائع کے گھر والوں سے اسکے دام دلوائے جائیں گے
اور اگر خریدار بڑبڑوں کو نہ لاسکا تو قاضی اسکو ۶ ماہ کی جہالت
دیگا، اگر اب بھی گواہ نہ مل سکے تو اسکی خیانت بھی جائیگی
اور سزا اسپر عود کر گئی، (دفعہ ۱۳۴ تا ۱۳۵)

اگر گدھے خدائوں کی مار سے تباہ ہو جائے یا اُس پر شیر
حملہ کرے تو چرواہا قاضی کے سامنے قسم کھا کر بری ہو جائیگا۔
(دفعہ ۲۶۶)

اگر کوئی اپنے ہمسایہ پاس گدھ یا بیل یا بھیڑیا کوئی
چارہ پایہ امانت رکھے اور وہ مر جائے یا چوٹ کھائے یا
بیکری کے دیکھے ہانک دیا جائے تو ان دونوں کے درمیان
خدائوں کی قسم سے فیصلہ کیا جائے کہ اس نے اپنے ہمسایہ کے
مال پر ہاتھ بڑھایا یا نہیں بڑھایا، اور مال کا مالک قبول کرے
تب وہ اُسکو ٹوٹا دے، (آیت ۱۰ و ۱۱)

جب کسی سے بیل یا بکری کا بچہ گم ہو جائے تو اسکو تنہا
بڑا دینا چاہیئے جتنا کہ وہ تھا، (دفعہ ۲۶۳)
اگر کسی نے بیل یا گدھ یا کراہیہ پر لیا اور اسکو شیر نے بھگ لیا
میں پیار ڈالا تو اسکا اُس سے مطالبہ نہ کیا جائے،
(دفعہ ۲۶۴)

اگر وہ مستاجر کے مارنے یا چھوڑ دینے سے مر جائے
تو اُسکو اس چیز کی قیمت دینا ہوگی اور اگر سینگ توٹا یا دامن
کاٹ لیا یا آستین ضائع کر دی تو چوتھائی قیمت ادا کرے۔ (دفعہ ۲۶۵ تا ۲۶۶)

(آیت ۱۳)

(آیت ۱۴)

پھر کیا تعجب ہے کہ علماء یہود نے بابلی زبان جاننے کی وجہ سے شریعت حمورابی سے جو عرصہ تک دور دور از
ہلک میں رائج تھی واقفیت پیدا کی ہو اور چونکہ وہ ان کے حالات اور طبیعت کے بہت موافق تھی اسلئے کیسے قدر
دوبدل کے ساتھ اسکو اپنی مذہبی کتاب بنا کر تورات نام رکھ دیا ہو،

(۵) سب سے اخیر یہ کہ ارتقا یورپ کا نہایت مسلم الثبوت مسئلہ ہے، پھر یہ کیونکر فرض کیا جاسکتا ہے کہ
حضرت موسیٰ کی شریعت دفعہ نہایت مکمل صورت میں ہمارے سامنے آگئی ہو، اور اس نے ترقی کی میانی
میں پل نہ کر لی ہوں۔

بہر حال ان دلائل کی بنا پر کیا ہمارے عیسائی دوست یہ ماننے کو تیار ہیں کہ حضرت موسیٰ کی شریعت
حمورابی بادشاہ بابل کی شریعت سے ماخوذ تھی؟



اگر کوئی ایک چوکری کو جو اسکی منگیت نہین دم دیکے
اس سے مباشرت کرے وہ البتہ اسے مہر دیکے اس سے
نکاح کرے، اگر اسکا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اسے اسکو
دے تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق اسے نقد دے۔

(آیت ۱۶ و ۱۷)

(دفعہ ۱۳۰)

ان چند عبارتوں کے علاوہ شریعت حمورابی اور کتاب الہمدین اور بھی مختلف حیثیتوں سے مشابہت
پائی جاتی ہے جو اجمالی طور پر درج ذیل ہے،

(۱) کتاب الہمد کے ابتداء میں ”یہوی“ کی عبادت کا طریقہ بتایا گیا ہے، پھر خدیشری احکام ہیں اور
وعظ و پند پر جا کر یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، حمورابی کی شریعت میں پہلے حمورابی کی عظمت و جلالت کا تذکرہ ہے
تو ان میں، اور سب سے آخر اپنے جانشین کو چند نصیحتیں کی ہیں،

(۲) فیصلہ کا طریقہ دونوں شریعتوں میں تقریباً یکساں ہے

(۳) توراۃ کے بعض مقامات میں ”بت پرستی“ کی جہلک نظر آتی تھی، اور چونکہ یہود کو توحید کا نہایت
شد و مد سے دعویٰ ہے، اسلئے وہ ان مقامات کی تفسیر میں سخت کوشاں تھے، بابل کے من قوانین کا انکشاف
ہوا تو یہودیوں کو ان مقامات کی تشریح میں کافی مدد ملی، مثلاً سفر خروج (۲۱-۲۲ و ۲۳-۲۸) میں ہے کہ جو
یا اور لوگ ”معبود“ یا مبدون کے سامنے لائے جائیں، چونکہ معبودوں کا لفظ تعلیم یہودیت کے خلاف نہ
اسلئے علماء اس کے معنی ”قاضی“ بیان کیا کرتے تھے، حمورابی کی شریعت نے اس راز کو اس طرح فاش کیا کہ
”مبدون“ سے مراد ہیکل ہوتا ہے جہاں لوگ فصل مقدمات کے لئے جایا کرتے تھے۔

(۴) یہودی کی اصل زبان عبرانی ہے، لیکن وہ لکھنے پڑھنے میں حضرت موسیٰ کے کئی صدیوں کے بعد متعلق
اس وقت تک یہود صرف بابلی زبان میں خط و کتابت کرتے تھے جو اس زمانہ کی نہایت وسیع اور عالمگیر زبان
تھی۔

یہ بحث حجت الہامی کے طور پر ہے ورنہ مذہبی حیثیت سے ہمارا وہی عقیدہ ہے جو عام مسلمانوں کا ہے، یعنی یہ کہ
تورات خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے،

مناظرہ

حکیم ہمدی

(۲)

از پروفیسر ایس بی ایچ کیننگ کالج کلکتہ

اس درمیان میں اودھ برائے برطانوی حکومت کے زیر نگیں رہا، شروع شروع اسکے خلاف سازشیں ہوئیں اور چند روز کے لئے اسے قید خانہ جانا پڑا، لیکن بادشاہ حکیم کی سفارش سے بہت جلد رہائی ہو گئی، اور دوبارہ جب عروج حاصل ہوا تو آخر تک قائم رہا، جبکہ اس نے خاص تدبیریں کیں کہ بادشاہ غازی الدین کو خوب منشیات و مخدرات پر نگاہ رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے کمان تو ہر جگہ دوبارہ سے ملاقات ہوتی تھی، اور کمان اب دوسرے تیسرے ہیڈہ اسکی ذمہ آئے لگی، دوسرے یہ کہ اس بادشاہ اور اسکے فرزند کے درمیان نفاق ڈلوادیا، گو جب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولیم کو اس سے عداوت ہو گئی جو شاید کسی قدر مبالغہ کے ساتھ یہ بیان کرتا ہے کہ آغا میر علاوہ ۲۵ ہزار ماہانہ تنخواہ کے خود اپنے لئے ہر سال ۲۳ لاکھ سالانہ کی رقم رعایا سے وصول کرتا تھا، اور سرکاری حسابات کے مطابق ۳۳ لاکھ سرکاری خزانہ سے اس نے جو جو اسرافات و زرفات منہم کیا، اس کا شمار ہی نہیں، پھر میرے عہد حکومت میں اس خزانہ کو جھڑک لوٹا وہ سب پر روشن ہے۔ آغا میر حکومت انگریزی کی ہر توجہ برص ہلال کی مخالفت کرتا رہا، بایں ہمارا انتظام اس قدر معقول تھا کہ اسکے زمانہ میں دارالسلطنت اور اسکے مضافات ویسی ہی محفوظ رہے جیسے ہندوستان کا کوئی اور شہر ہو سکتا تھا۔

غازی الدین حیدر کی وفات پر آغا میر نے استعفا دیدیا، لیکن بادشاہ سے ظاہری ملاپ ہوا اور ریزیڈنٹ سے اپنی حفاظت کا اقرار کرا لینے کے بعد پھر اس نے منصب وزارت پر قدم رکھا۔

دسمبر ۱۸۲۶ء میں معزول کیا گیا،

اب نصیر الدین حیدر نے حکیم ہمدی کو پھر بحال کرنا چاہا بلکہ تقرر نامہ تک انکے پاس بھیج دیا، لیکن بادشاہ حکیم (زوجہ غازی الدین حیدر) کی ضد سے مجبور ہو کر اس حکم کو منسوخ کرنا پڑا، اور یہ منصب بادشاہ حکیم کے ایک خاص سفارشی، فضل علی کو جسے مناجان سے نسبت ابوت دیجاتی ہے، تفویض کرنا پڑا، اس نے اپنا خزانہ ۳۵ لاکھ کے سرمایہ سے مالا مال کر کے فردی ۱۸۲۹ء میں استعفا دیدیا۔

فضل علی اور اسکے دو جانشین رام دیال و اکبر علی کے زمانہ میں اودھ کی حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی، لکنو کی گلیاں اور قرب دوار کی سڑکیں ہر شب قتل و غارت کی تماشگاہ رہتی تھیں ملک میں دیوانی فوجداری کسی قسم کا قانون نہ تھا، اور گوفوج کے سارے سپاہی جنگی تعداد، ہم ہزار تھی، مختلف مقامات پر تحصیل وصول کے لئے متین تھے، لیکن عملاً اس فرض کو انجام دینے سے بالکل قاصر تھے، بالآخر ریزیڈنٹ کی تحریکات پیہم سے مجبور ہو کر بادشاہ نے جون ۱۸۳۳ء میں حکیم ہمدی کو خلعت وزارت سے سرفراز کیا اور علاوہ دیگر خطابات و القاب کے ختم الدولہ کا بھی لقب بخشا جو آج تک زبان زد ہے۔

گرچہ ہی روز میں ریزیڈنٹ اور وزیر سے بے لطفی ہو گئی، سرٹیفیکٹ حکیم ہمدی سے شروع ہی سے خوش تھے، انکے خیال میں حکیم ہمدی انگریزوں کے اثر کے مخالف تھے، اسلئے وہ چاہتے تھے کہ یا تو وزارت سے معزول کر دیے جائیں یا خود انکی ماتحتی میں آجائیں، لارڈ بینٹنک (گورنر جنرل) نے اس رائے کو اپنڈ کیا اور حسب ذیل تحریر فرمایا۔

”میں وزیر کی مخالفت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ قطعاً اس وقت ہندوستان کے بہترین اشخاص میں سے

اور بحیثیت اعلیٰ افسر مال کے اس سے بڑھ کر تمام ملک میں کیا انگریز اور کیا ہندوستانی کوئی شخص نہیں

اسے اس امر کا شروع ہی سے احساس ہے کہ ریزیڈنٹ کو بجز اسکے کہ خود تخت اودھ بچائے اور

کوئی شے مطمئن نہیں کر سکتی اور اسکے لئے وزیر کی طرح آمادہ نہیں، البتہ مجھے یہ امید تھی اور اب بھی

کہ ایسا شخص جو نظم و نسق کی قابلیت میں تمام معاصرین سے افضل ہے، اگر ریڈنٹ اسے اپنے مشورہ جنکا اہم خواہ کتنا ہی قلمی و مضبوط ہو، تاہم ادب و احترام اور رشتی کا پہلو ہی لئے ہوئے ہو خلوص دل سے دیتے رہیں، تو وہ بھی اصلاح مملکت میں بدل کو شان ریگا۔

گورنر جنرل نے یہ رائے اپنے چشم دید حالات دیکھنے کے بعد قائم کی تھی، اس اظہار خیال کے بعد میڈک کا اپنی جگہ پر رہنا ناممکن تھا، چنانچہ وہ ہٹا دیے گئے، اور اگست ۱۸۳۱ء میں میجر کو ریڈنٹ ہوئے جو ۱۸۳۱ء تک اس عہدہ پر رہے،

اس اشار میں منظم الدولہ کی دیانت پر اکثر حلقوں میں بدگمانی ہونے لگی، اس بنا پر کہ انھوں نے سلطنت کے محافل میں جملہ داخل سرکاری پر بادشاہ سے پانچ فیصدی کی رقم اپنے لئے منظور کرانی خود حکیم مہدی کا بیان یہ تھا کہ یہ رقوم وہ اپنے تصرف میں نہیں لینا چاہتے تھے، بلکہ انہیں سرکاری خزانہ جمع کر کے کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ کی نذر کر دینے کا ارادہ رکھتے تھے، اور اس رقم کی بابت منظوری محافل کے مقصود صرف یہ تھا کہ بادشاہ کی نظروں میں انکار سوخ سب کو معلوم ہو جائے، اور اس طرح ملک پر خاص اثر و اقتدار قائم ہو جائے، حکیم مہدی کے اس بیان کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے چہرے جب شاہ نصیر الدین حیدر خان سے نا دش ہوئے تو ان پر ہجلا اور الزامات کے ایک یہ بھی تھا کہ رقم میں سے کچھ غلب کر گئے تھے۔

لارڈ ہٹنگ کو منظم الدولہ پر جو اعتبار تھا وہ اسکے اہل ثابت ہوئے، اپنے تقرر کے بعد ہی وہ منظم الدولہ سے اصلاح کی جانب مشغول ہو گئے، چنانچہ اپریل ۱۸۳۱ء میں جب بادشاہ نے اصلاحات نافذ کرنے کی یادداشت مرتب کی تو معلوم ہوا کہ اصلاحات ذیل اتنے ہی عرصہ میں عمل میں آچکی ہیں، مصارف مرکزی بہت گھٹ گئے تھے، ابواب اسراف ایک بڑی حد تک بند ہو چکے تھے، تنخواہ ملازمین کی بقایا جو سالوں سے چلی آتی تھی، بیباق ہو چکی تھی، نظم و نسق مملکت کے متعلق ایک کتاب آئین ضوابط

ہو چکی تھی، علاقہ محمدی و خیر آباد کی بغاوتوں کا استیصال ہو چکا تھا، اور زراعت و تجارت میں کافی ترقی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔

یہ نہ بچنا چاہیے کہ ان اصلاحات کے نفاذ کے وقت کوئی مخالفت یا شورش نہیں ہوئی بلکہ جب بے ضابطہ توپخانہ والوں کی بقایا مباح کر کے انہیں ہر طرف کیا جانے لگا تو بے شک ہنسی کہ سپہ سالار مظفر علی خان اور بادشاہ بیگم کی شاہ پاکر فوج نے پوری بغاوت کر دی تھی۔

جولائی ۱۸۳۱ء میں انھوں نے پورا تہیہ کر لیا کہ ملک میں بجائے کاشتکاری کے امانی کا طریقہ رائج کریں، انکی تجویز یہ تھی کہ موجودہ عاملوں کو بطور جہتیمین امانی کے بدستور برقرار رکھیں، ملک کے چاروں صوبوں میں ایک ایک محفل (کلکٹر) مقرر کریں، اور گنگا کے کنارہ کا سرکش علاقہ جہان اکثر بیگمات شاہی کی جاگیر میں بنیں، براہ راست اپنی ماتحتی میں رکھیں۔

اصلاح کی راہ میں بڑی دقت یہ حال تھی کہ رعایا کا کوئی ایسا طبقہ موجود نہ تھا جس میں سے متدین مال کا انتخاب کیا جاسکے، وزیر نے پورے اشخاص کو عامل مقرر کرنے کی تجویز کی، لیکن اسے گورنر جنرل نے منظور کر دیا، ریڈنٹ کے اس استفسار کے جواب میں کہ کیا ملک میں کوئی کار گزار شخص نہیں، وزیر نے حسب ذیل جواب دیا۔

”میرے علم میں تو کوئی بھی نہیں، ملک سے علوم و فنون و انتظام ہر قسم کی قابلیت مدت ہوئی

سلب ہو چکی ہے، نہ کوئی تعلیم ہے، نہ کوئی مدرسہ ہے، نہ کوئی تعلیم گاہ ہے جہاں سے قابل اشخاص لئے جاسکیں، میرے علم میں ملکی لوگوں میں ایک شخص بھی کام کی اہلیت و صلاحیت نہیں رکھتا۔“

میر فاروق نے تو اگر ریڈنٹ کی مدد و اصلاح شریک نہ ہو تو اودھ مطلق ترقی نہیں کر سکتا۔“

منظم الدولہ کو انگریزی حکومت سے خاص شکایت کا سبب یہ پیدا ہوا کہ ملک کی شورش فساد کے نتیجے میں انھوں نے کمپنی بہادر کی افواج کی مدد و چاہی، اور اس سے انگریزوں نے انکار کیا، کمپنی اور شاہ کے

تعلقات کی بنیاد معاہدہ سنہ ۱۸۵۷ء پر تھی، جس میں قرار دیا گیا تھا کہ نواب کو اندرونی و بیرونی نظم کے مقابلہ میں دیجاگی، ساتھ ہی نواب سعادت علی خان اپنے علاقہ خاص میں ایسا نظم و نسق قائم رکھیں گے جس سے فلاح و بہبود ہو، اور باشندگان ملک کے جان و مال کی حفاظت متصور ہو، اور شاہ اودھ ہمیشہ ان کے اصلاح و ترقی کے مطابق عملدرآمد کریں گے۔ لیکن اس شرط کو فرمانروایان اودھ ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے اور حکومت انگریزی کے ارکان کا کہنا یہ تھا کہ جب نواب اپنے ہاں کا نظم و نسق درست نہیں رکھتے ہم سے اعانت کے طالب کس حق سے ہوتے ہیں، غرض اس وقت اس منطقی قیاس تحمل المصداق کا یہ کہ بقول حکیم ہمدی کے اعانت اسلئے ضروری تھی کہ اصلاحات درپیش ہتھیں، اور بقول گورنر جنرل کے صرف اس وقت مل سکتی تھی جب نظم و نسق میں اصلاحات ہو چکی ہوں، لیکن ان سب رکاوٹوں کے باوجود بھی اصلاح کا قدم آگے بڑھتا ہی رہا، مگر وہ اپنے ایک

مرسلہ مورخہ ۱۲ جون ۱۸۵۷ء میں وزیر کے خلوص و تہذیب کی شہادت دینے کے بعد جو اصلاحات لارڈ دارلہو عمل میں آچکی تھیں، انکی ایک فہرست دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کا برا قلعہ ہونے کا طریقہ انسانی کے زیر ہتھام آچکا تھا، بنگلہ ایک کروڑ چالیس لاکھ کی مجموعی مالگداری کے ۹۲ لاکھ وصول لگاتا، لکھنؤ میں ایک خاص عدالت قائم ہو گئی تھی، جو عاملوں کے خلاف استغاثہ سنتی تھی، اور جہاں غیر مستدین عمال کو عبرتناک سزائیں ملتی تھیں، چنانچہ دو تھانہ داروں کو جن پر رشوت ستانی کا جرم ثابت یہ سزائی کہ جہانہ دتاریانہ کے بعد انہیں شہر بدر کر کے آکامٹھ کالا کیا گیا، اور گدے کی پشت پر انہیں اُلے کر کے بازاروں میں پھرایا گیا، یہ نظیر ریڈنٹ کے خیال میں دوسروں کے لئے خاص طور پر عبرت انگیز ہوئی ہوگی، علاقہ جاگیر بنگات میں ڈاکوؤں کے استیصال کے لئے خاص پولیس تعینات ہوئی جسکی کارکردگی بیشہ یہ ہوا کہ پروس کے انگریزی علاقہ آباد میں پولیس کے سواروں کی تعداد میں تخفیف کر دینا پڑی۔

ختم الدولہ کی عدل گستری نے ایسا عام اعتماد پیدا کر لیا، کہ میسورن زیندار جو سالہا سال سے

حکومت کے خلاف سرکشی کر رہے تھے، اب از خود آکر محالمت کرنے لگے، ملک میں علانیہ بغاوت کا نام بھی نہ باہر آتا، کہ آخری نوہمینہ کے زمانہ میں مسلح فوج کی تعداد میں بقدر ۱۸ ہزار سپاہیوں کے تخفیف کر دی گئی۔ وزیرین عیوب یہ تھے کہ مزاج میں شک و بدگمانی تھی، اور غصہ جلد آجاتا تھا، بعض سرکاری مصارف بے اعتدال تھے اور ہتھوڑوں کے موقع پر ضرورت سے زیادہ جزیسی برتا تھا، حالانکہ ایسے مواقع پر غور و خیر بھی کیا جانی چاہئے تھا کہ رعایا کا دل ہاتھ میں لیا جاسکتا تھا، اسکے علاوہ جزییات امور میں حد سے زیادہ وقت صرف کرتا تھا، لیکن اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے ۲۰ برس کی مدت میں جتنے دوزخ سلطنت ہوئے تھے وہ ان سے زیادہ قابل و کار گذارتھا۔

جولائی ۱۸۵۷ء کے آخر ہفتہ میں بادشاہ حکیم ہمدی کے درمیان بے لطفی کی خبریں میجر لو کے کانوں تک پہنچیں، یہاں تک کہ ۳۰ کی شام کو وکیل سلطانی تاج الدین حسین خان ریڈنٹ کے پاس بادشاہ سے تجلیہ کی بات کا وقت مقرر کرانے آئے، اور ریڈنٹ کے استفسار کے جواب میں بیان کیا کہ بادشاہ کے شک و طبع کے اصلی اسباب یہ ہیں کہ نصیر الدین حیدر پرانکی والدہ بادشاہ بیگم کا بہت اثر ہے، اور وہ حکیم ہمدی کی صورت سے بہت زیادہ متاثر ہیں، دوسرے یہ کہ بیگم شاہی، اعزہ شاہی و ارکان دربار میں سے کوئی وزیر کا ہمدرد و دوست نہیں، اگرچہ کوئی نہ دغائے میں تخفیف ہو گئی ہے، تغلب و تصرف کے مواقع گھٹ گئے ہیں، اور بعض نو وزیر کی سخت دست گیری سن چکے ہیں، اسلئے اکثر ان کے مخالف دشمن ہیں۔

دوسرے روز ریڈنٹ بادشاہ کے ہمراہ سوار ہو کر دلکش کانا کھانے گئے، بادشاہ نے حکیم ہمدی کے خلاف بعض مضحکہ خیز شکایات بیان کیں، مثلاً یہ کہ وہ مجھے زہر دیکر خود بادشاہ بننا چاہتا ہے، بادشاہ بیگم نیز میری محبوب ملکہ قدسیہ بیگم کی علانیہ توہین کر چکا ہے، ایک مرتبہ اس نے میرے والد مخفور کی تصویر پر لالت مار دی ہے، وغیرہ، ریڈنٹ نے یہ جواب دیا کہ بادشاہ تک یہ شکایات قطعاً غلط پہنچی ہیں، نیز یہ کہ حکیم ہمدی کی عزت و گورنر جنرل کی سخت ناخوشی کا باعث ہوگی، سپر نصیر الدین حیدر نے وعدہ کیا کہ نصیر ریڈنٹ کو اطلاع

دیئے وہ کوئی کاروائی نہ کریگا۔ لیکن باوجود اس وعدہ کے اس نے وزیر پر علانیہ متمولی قائم رکھی وزیر کے دشمن منظر علیخان کو قید سے رہا کر دیا، اور وزیر کو خورشید منزل میں حاضری کی ممانعت کر دی، جہاں تمام دربار کے خیمہ نصب ہوئے تھے۔ یہ خبر جوہنی مشہور ہوئی، شہر میں شورش ایلو ہونے لگے، رزیدنٹ نے صفائی کرانا چاہی اور بظاہر اسمین کامیابی بھی ہوئی، وزیر نے اپنے تمام نادانستہ گناہوں پر دست بردہ عقد تقصیر جاری کیا اور صفائی دی، لیکن عین وہی شب اس نے اپنے شیراز جدید روشن الدولہ، منظر علیخان، جعفر علیخان، کنور رتن سنگھ کے ساتھ مشورہ میں صرف کی، یہ سب کے سب بحر دشمن الدولہ کے بدترین اشخاص تھے اور انھوں نے حکیم ہمدی کی گرفتاری کا پرزور مشورہ دیا، صبح کو وزیر کو یہ حکم ملا کہ خانہ نشین ہو جائے اور ہمدی سرکاری کو اس سے ملنے کی ممانعت ہوگئی، لیکن بادشاہ میں اتنی مہمت نہ تھی کہ اسکی معزولی کا فرمان صادر کیا جاتا تھا یہ کی کہ میجر کو کے پاس یہ پیام بھیجا کہ اگر آپ حکیم ہمدی کو طلب کر کے برطرف کر دیں تو میں ۲۵ لاکھ کرتا ہوں، رزیدنٹ نے جواب دیا کہ میں ۲۵ کروڑ لیکر بھی ایسی فرمائشوں کی تعمیل سے معذور ہوں۔

۸۔ اگست کو بادشاہ رزیدنٹ کے ہاں تشریف لائے اور کہا کہ اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس سلطنت بغیر کسی وزیر کے بذات خود انجام دوں گا، اور منظم الدولہ کو اجازت ہے کہ لکھنؤ سے باہر جہاں چاہے چلے جائیں۔

۹۔ اگست کو حکیم ہمدی قصر شاہی کے ایوان وزارت سے شب کے وقت چپ کر نکلے اور شہر میں جو اپنا قدیم مکان ۳۰ سال سے تھا، اسمین چلے آئے، اسلئے کہ حکیم ہمدی نے آغا میر کی طرح اپنے لئے محل بنین تعمیر کرائے تھے، میان ماسچ تک رہے، جب جا کر روانگی فتحگڑھ کی اجازت ملی۔

ناسخ نے اُنکے زوال کی دلچسپ تاریخ نکالی ہے۔

افتاد حکیم از مراتب
تاریخ بظہر ز نور رقم کن
در حائے حکیم بہشت برگیر
سہ مرتبہ نصف نصف کم کن
۱۲۳۸ھ

۱۰۔ اگست کو حکیم ہمدی کے افسوسناک نتائج کا اندازہ مالگذاری کے اعداد سے ہو سکتا ہے، اکتوبر ۱۹۳۷ء سے فروری ۱۹۳۷ء تک مالگذاری کی آمدنی ۴۰ لاکھ ۶۴ ہزار تھی، دوسرے سال انہیں پانچ لاکھ ۱۸ لاکھ ۴۴ ہزار وصول ہوئے۔

منظر علیخان کی عاشق مسز فیضی پارکس نے حکیم ہمدی سے اُنکے عہد وزارت میں ملاقات کی تھی اس کے بعد انکی معزولی کے زمانہ میں فتحگڑھ میں ان سے پھر ملی، اس کے روز نامہ چہ سیاست میں حکیم ہمدی کے متعلق بعض بہت دلچسپ معلومات ہیں، ۱۹۳۵ء میں جب وہ ملی ہے، وہ محرم کے اہتمام میں مشغول تھے، بقول اُس کے حکیم ہمدی بڑے مذہبی آدمی تھے، اور روزہ نہایت پابندی و استقلال کے ساتھ رکھتے تھے، مسز پارکس نے ایک کاغذ نشان کا بھی معائنہ کیا جو انھوں نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ نادار کشمیریوں کی اس سے پرورش ہو، چنانچہ تین چار کارگیر اسمین کام کر رہے تھے، اور ایک مدرسہ بھی وہیں قائم تھا۔

نصیر الدین حیدر کی وفات پر حکیم ہمدی پھر منصب وزارت پر سرفراز ہوئے، مسز پارکس کے روزنامہ کا ایک اندراج یہ ہے:-

۲۳۔ ستمبر ۱۹۳۵ء۔ نواب حکیم ہمدی پھر وزیر مقرر ہوئے ہیں، آج اپنی پیرائہ سانی میں وہ کس قدر خوش

ہوئے، فتحگڑھ میں مدتوں سے وہ اپنے اعزاز رفتہ کے حصول کی تمنا کر رہے تھے، نواب اودھ کے

نقص سے روانہ ہو گئے، مگر کوچ کے پہلے ہی دن جس گھوڑے کی پشت پر نقارہ تہادہ گرا اور مر گیا،

نزدیک ٹوپ اُلت گئی، یہ دونوں سخت بدشگونئی کے واقعات ہوئے۔

اس کے بعد ۲۵ دسمبر کی تاریخ کے ذیل میں نواب کے انتقال کی خبر درج ہے،

(یوپی، ہستاریکل سوسائٹی جرنل)

تصوف اور تناسخ

(از مسٹر پریشورام لال)

ہمارے ہندو برادران وطن خود ہندوستان میں انگریزی کے جہت مند علی رسائی نکال رہے ہیں کوئی مسلمان ان سے کمتر بھی کوئی انگریزی رسالہ نہیں نکالتا، پھر جس شخص اور تلاش کے ساتھ پڑھتے ہیں علوم و تاریخ کو حکمران طبقہ تک پہنچا رہے ہیں وہ خود انکی قومی عزت کے پایہ کو بلند کر رہے ہیں، سپران کامزید احسان یہ ہے کہ کبھی کبھی اس علمی مجلس میں وہ مسلمانوں کو بھی بلا لیتے ہیں، یعنی انکے عدم و تاریخ کے متعلق بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں، لیکن ہر قوم کو دوسری قوم کے ساتھ جو فطری بیگانگی ہوتی ہے وہ اغلاط اور غرضوں کی موجب بن جاتی ہے، ذیل کا مضمون ایک ہندو فاضل نے ہندوستان ریویو میں شائع کر لیا ہے، اس مضمون میں گو متعدد مسامحات ہیں، لیکن ہم اسلئے اسکو شائع کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ہمارے برادران وطن ہم سے کس حد تک واقف ہیں،

پتہ جنم یا عقیدہ تناسخ دنیا کے تمام آریہ مذاہب یعنی ہندو، جین اور بدھ مذہبوں کا جزو رہا ہے، بخلاف اسکے سامی مذاہب یعنی اسلام، عیسیت، و ہودیت کے ارکان اعظم ہمیشہ اسکے منکر رہے ہیں، ان میں سے یہود نے اپنی قلت تعداد کی بنا پر کوئی اہمیت نہیں رکھتے، رہے ہندوستانی سبھی، سودہ بھی ہندوستان کی قومی زندگی میں جذب ہوتے جاتے ہیں، اسلئے انکے اور ہندوؤں کے مذہبی اختلافات چند ان قابل التفات نہیں، البتہ مسلمانوں کی حالت ان دونوں سے مختلف ہے، ان کا اور ہندوؤں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور انکے مسلک تصوف سے توقع ہو سکتی تھی کہ سلسلہ تناسخ انکے بان جزو عقاید ہوگا، لیکن انکے ائمہ تصوف عموماً اسکے منکر ہیں۔

مسلمانوں کی آبادی میں نوے فیصدی اہل سنت ہیں، یہ سواد اعظم تمام تشریعت کا متبع ہے، تاہم فارسی زبان کی وساطت سے یہ فرقہ سلوک و عرفان، طریقت و روحانیت سے نا آشنا رہا ہے، اور تصوف کو تسلیم

کر لینے کے بعد ہندو مسلمانوں کی مذہبی تفریق بھی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی، ہندو صوفی اور مسلمان صوفی میں جو کچھ فرق ہے، وہ تاریخی اسباب کا معلول ہے، نہ اصول مذہب کے اختلافات کا، جس طرح ہندوؤں کے بان "ہودیت" و "بودیت" کے دو مختلف مسلک تھے، بدینہ ہی طرح مسلمان صوفیہ میں بھی بعض ہمہ دوست کے تھے، اور اسی طرح موجودہ ہندویت کے عقیدہ "وشتت" و "دیت" کی تعلیم بھی مسلمان صوفی شغرا کے بان کثرت سے ملتی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باہین ہمہ تشابہ و اشتراک عقیدہ تناسخ صوفیوں کے مسلک سے خارج ہے، میں نے جن مسلمان علماء سے تشفی چاہی، وہ سب تناسخ کے منکر نظر آئے، نہ صرف ایک جسم انسانی سے دوسرے جسم انسانی میں بلکہ سرے سے ارتقا سے روحانی کے!

لیکن میرے نزدیک اگر اصل تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو شاید اس مسئلہ کا حل پوچھا جاسکے، امام غزالی کی جلیل القدر تصنیف "حیاء العلوم" کے مطالعہ سے جبکا اردو ترجمہ ہو چکا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اہم قوم پر فلاطون کے عالم مثال کی بل پر گفتگو کر رہا ہے، امام موصوف نے فلاطون کی تصانیف اگر اصل یونانی میں نہیں، تو کم از کم انکا عربی ترجمہ ضرور مطالعہ کیا تھا، اور حکیم یونان کی تعلیمات کا اس سامی النسل امام عظیم کے خیالات پر یقیناً بہت عمیق اثر پڑا تھا، لیکن اس سلسلہ تناسخ کو حکیم ہندو نے شاید حکیم یونان سے بھی زائد ایک قابل افتخار خیال کی، اور اسے ہمیشہ "علم سینہ" کی طرح محفوظ رکھنا چاہا، انکے نزدیک یہ بات بر ملا کہنے والی نہ تھی، اور اسلئے انھوں نے اس خیال کو بڑے گہرے پردوں میں ادا کیا ہے، غزالی کا زمانہ وہ تھا جب خلافت عباسیہ کا شباب تھا، اور شریعت کی ادنیٰ سی مخالفت بھی قابل تعزیر تھی، اسکے علاوہ دور عباسیہ کی ایک اور فوسکا خصوصیت بھی جس نے انکی حکومت کو علم کشی و علم پروری کا جامع اضداد بنا دیا تھا، ملحوظ رکھنا چاہیئے، خلفاء امین شہسپاہین کہ بہت بڑے علم دوست و علم پرور تھے، چنانچہ یونانی، رومی، و سریانی بلکہ سنسکرت تک کی ہشمار کتابوں کا انھیں نے ترجمہ کروایا، لیکن وہ اپنی زبان سے کسی دوسری زبان کو فضل و اشرف نہیں دیکھ سکتے تھے، اسلئے اسی علم پروری کے پہلو میں علم کشی بھی جاری تھی، یعنی تراجم کے بعد دوسری زبانوں کی اصل تصانیف

۱۳۸ ساری
صحیح نہیں لکھا
بلکہ جوہر کی جاو
کا شباب تھا،

کرتے تھے لیکن رومی بہ آواز بلند پکار پکار کر کہتے ہیں،

من ز سر آن مغز را برواشتم استخوان پیش رگان انداختم

یہ "کون ہیں؟ جبہ پوشان علوم ظاہر چنانچہ رومی کے بعد سے صوفیہ نے عموماً یہی لہجہ علماء ظاہر کے متعلق اختیار کر لیا، اور دنیا سے اسلام میں رومی کی عظمت ستم ہو گئی، جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا،

ہست قرآن در زبان پہلوی تنہوی مولوی معنوی

من چہ گویم وصف آن عایجناب نیست پیمبر دے دار و کتاب

مولانا رومی نے ان اسرار کو بالکل بے نقاب کر دیا، فرماتے ہیں،

بچو سبزه بار بار ویدہم ہفت صد ہفتاد قالب دیدہم

آج کل کے تیس سو فٹ گروہ کو سات سو برس پیشتر کے اس مقدس سلامی لٹریچر میں، مام کا عدد

دیکھ کر تعجباً ایک خوشگوار تجربہ ہوگا، لیکن اس شعر کی عام علمائے اسلام بالکل مختلف تاویلات کرتے ہیں، پہلی

ہم اس سے قطع نظر کر کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جنہیں مولانا نے شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں

چھوڑی ہے، ارشاد ہوتا ہے،

از جہادی مردم دنامی شدم از نام مردم بہ حیوان سرزدم

مردم از حیوانی و آدم شدم پس چہ ترسم کے ز مردم کم شوم

تا بہ آرم از ملک بال و پر جملہ دیگر میرم از بشر

از ملک ہم بایدم جستن ز جو کل شبہ ہمارک ولا دجہد

باز دیگر از ملک قربان شوم انچہ اندر دم ناپایان شوم

پس عدم گروم عدم چون رغبت گویدم کا نا ایہ راجون

فقیدہ سناج کی اس واضح و صریح تعلیم کی نظیر اگر کہیں مل سکتی ہے، تو صرف آریہ دھرم کے لٹریچر میں

جلاؤالی جاتی ہیں، تاکہ کوئی زبان سطح ارض پر عربی کی حریف باقی نہ رہ جائے، لیکن اسکا نتیجہ یہ ہو رہا ہے

یونانیوں وغیرہ کے جو اصل خیالات تھے وہ پوری قوت و وضاحت کے ساتھ منتقل نہ ہو سکے، اسلئے

خواہ کتنی ہی کاوش و قابلیت سے کیا جائے، پھر بھی ترجمہ ہے، اصل کی قوت و صفائی اس میں کمان

ہم سکتی ہے، امام غزالی نے بھی یونانیوں نیز مصر کے اشرافین جدید سے انہیں تراجم کے ذریعہ سے

کیا ہوگا، اسلئے گویا رین قدم قدم پر فلاطون کی جہلک نظر آتی ہے، لیکن وہی ناصفا فی اور دھندل

ساتھ، اس میں شبہ نہیں کہ غزالی کا مرتبہ اہل طریقت میں بہت ممتاز ہوا ہے، انھوں نے علوم ظاہری کی

تلافی اپنی قوت باطنی سے کر لی تھی، تاہم روح کی تدبیر کی ترقی و تناسخ کا ذکر تصریح کے ساتھ انکے ہاں نہیں

غزالی کے بعد ہی تار یون کا سیلاب آیا، جس نے اہل عرب کی علمی زندگی کا خاتمہ کر دیا، اور

ہلا کو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، لیکن فتنہ ہلا کو سے پیشتر ہی ممالک اسلامی میں انتشار

طوائف الملوک کا دور دورہ ہو گیا تھا، اور یہ حالت تقریباً دیرہ صدی تک قائم رہی، یہی وہ زمانہ ہے

موجودہ فارسی شاعری عالم وجود میں آئی، اور مسلمانوں نے فقہ و شریعت کے دائرہ سے نکل کر اسرار کائنات

آزادانہ غور و تدبر شروع کیا، اسی زمانہ میں تصوف نے ایک مستقل حیثیت پیدا کی، یہاں تک کہ شمس

اور مولانا روم کے زمانہ میں مستان انہی کی ایک بالکل نئی بساط قائم ہو گئی تھی، شمس تبریزی کی خود کوئی

موجود نہیں، جو دیوان و کلیات انکے نام سے مشہور ہے وہ انکے شاگرد رشید مولانا روم کا

ہند کے مشائخ میں شمس تبریزی غزالیین بجا طور پر نہایت مقبول ہیں، اور اکثر سماع کی محفول میں حاضر

ان پر حال آتا ہے، (اسی کیفیت کو دیکھ کر بعض مغربی مصنفین ان صوفیوں کو درویشان رفاص سے

کرتے ہیں)، میں کلیات شمس تبریزی کو بھی تمام و کمال مطالعہ نہیں کر سکا ہوں، تاہم یہ بالکل یقینی ہے کہ شمس

اور مولانا روم کا طرز بیان مصنف احیاء العلوم کے لب و لہجہ سے بالکل مختلف ہے، غزالی زریں

سارف: یہ سر پانچویں اور اسی کوئی خال کتاب میں ہے، لیکن اس میں بہت دور دورے سے یہ واقعہ لکھا

رومی کا زمانہ تصنیف تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں تھا، لیکن اسی کے بعد ہی دنیا سے اسلام
 من و نظم قائم ہو گیا، ایران میں ایک شیعی حکومت قائم ہو گئی، مغل و ترک قبائل آل عثمان میں غم ہو گیا
 پر خلجیوں کا تسلط قائم ہو گیا، اور دکن میں بہمنی خاندان کا پرچم لہرانے لگا، غرض یہ کہ ہندوستان سے لیکر
 واپس تک سارا قطعہ ارض اسلام کے زیر نگین آ گیا، لیکن فرقہ و شیعہ کو صوفیہ کے ساتھ عباسیوں سے بھی
 عداوت تھی، اور ترکوں کو علم و روشن خیالی سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان اقوام میں تصوف کو
 سرسبزی نہ چھل ہو سکی، بے دیکے صرف ہندوستان ایک ایسا ملک تھا جہاں تصوف کا نشوونما ہو سکا

اس معارف
 یہ بھی صحیح نہیں

بیان قدرتی طور پر اسلامی تصوف، ہندوؤں کی تعلیمات سے کافی متاثر ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہی تصوف
 مولد یعنی ایران میں صرف مسلمانوں تک محدود رہا، ہندوستان میں اسکے فیض کا دائرہ نہایت وسیع
 اور اس نے کفر و اسلام کا امتیاز اٹھا دیا، دربار اکبری کا شاعر اسی صوفیانہ خیال کو اکرنا ہے،
 درحیرتم کہ دشمنی کفر و دین چراست ازیک چراغ کعبہ و تاجانہ روشن ست

لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پیشتر مسلمان علم و حکمت
 خالی ہو چکے تھے، حکماء اسلام کا آخری شخص بوعلی سینا اس وقت تھا جبکہ محمود غزنوی قتل و غارت
 مصروف تھا، مولانا سے روم اسکے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد پیدا ہوئے، اور انھوں نے چہرہ حقائق سے
 آئنا، لیکن مٹا اسلام کے دنیوی اقتدار کی بازگشت کے ساتھ فقہ و شریعت کی حکومت قائم ہو گئی، اور
 خوف سے سرستان معرفت کو بھی زبان کھولنے کی جرأت نہ ہو سکی، نوبت یہ پہنچی کہ شمس تبریزی
 مشہور و لاجواب غزل کے

چہ تدبیرے مسلمانان کہ من خود رانمی دانم
 نہ تر سادہ یو دیم نہ گسرم نہ مسلمانم
 مکافہ لامکان باشد نشانم بے نشان باشد
 نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من خود جان جانم
 دوئی از خود برون دادم، یکے دیدم دو عالم را
 یکے جویم یکے گویم یکے دانم یکے خوانم

دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی کو مسخ کر کے عام اہل اسلام یوں پڑھتے ہیں: نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من انجان جانانم
 اس طرح علماء شریعت کے ڈر سے ہمہ دوست کے اعلیٰ ترین تخیل کو ہمہ زدست کی مستی پر لے آتے ہیں۔
 غرض یہ کہ گونا گونا گویا اسلام تنازع کے قطعی منکر ہیں، لیکن طریقت کی سطح شریعت سے بلند تر ہے اور
 ان پر حقیقت بے نقاب نظر آتا ہے، البتہ اسکے نظر آنے کے لئے بھی چشم بصیرت چاہیئے اسرار
 صوف بر کس و ناکس کے لئے نہیں ہوتے۔

معارف:

وحدة الوجود، تنازع اور ارتقا سب علیحدہ علیحدہ مفہوم ہیں، مفہوم نگار نے ان تینوں کو ایک معنی
 میں لپیٹا ہے، تنازع جن شرائط اور قیود کے ساتھ ہندو فلسفہ میں تسلیم کیا گیا ہے، وہ نہ صرف اسلام بلکہ تمام سامی
 مذہب کے مسئلہ جزا و سزا کے مخالف ہے، وحدة الوجود کا مسئلہ کم و بیش اکثر صوفی مسلمانوں میں تسلیم کیا جاتا ہے،
 اسکی تفصیل میں ان میں باہم اتحاد اسے نہیں، اور اسلام سے اسکی مطابقت و مخالفت کا سوال درحقیقت اسی
 تفصیل کی نوعیت پر موقوف ہے، مسلمانوں میں اس مسئلہ کے سب سے بڑے علمبردار محی الدین عربی ہیں، مسئلہ
 ارتقا اپنے اجمالی مفہوم میں متحد حکماء اسلام کی تصریحات میں داخل ہے، خصوصاً مصنفین اخوان اصفہا
 نے اسکو یہ ارفع افغانی نے اسکی پوری تفصیل کی ہے، البتہ مولانا رومی نے اس نظریہ کا ایک قدم اور آگے
 بڑھایا، جنی حکماء ارتقا کا آخری زینہ انسانیت تک لا کر ختم کر دیتے تھے، مولانا نے ارتقا کا ایک اور قدم آگے
 بڑھایا کہ انسانیت کے درجہ تک توجہ انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے، روحانیت کی تکمیل ابھی نہیں ہوئی اسلئے
 انسانیت ہے کہ انسانیت سے نکل کر پہلے ملکوتیت اور پھر لاہوتیت میں داخل ہو۔

مولانا ایک اور مقام پر اسکی تشریح کرتے ہیں،
 آمدہ اول بہ تسلیم جماد
 دز جمادی در نہایتی اوتقاد
 سالہ اندر نہایتی عسر کرد
 دز جمادی یادنا و رد از نبرد

تَلْخِصٌ وَتَبْصِرَةٌ

مسئلہ خلافت اور علمائے یورپ

مسئلہ خلافت محض ایک سیاسی مسئلہ نہیں، بلکہ کم از کم مسلمانوں کے لئے تو تاریخی، علمی، تمدنی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ پچھلے چند ماہ میں انگریزی جرائد و رسائل نے اس پر جو نہایت کثرت سے مضمون آرائیاں کیں، ان کا بیشتر حصہ ایک انبار ہے سیاسی خرافات کا، تاہم دریا کی گہرائیوں میں کبھی موتی بھی نکل آتے ہیں، سر فہرڈ مارین نے اس موضوع پر نامگزین متعدد مضامین لکھے، ایک مضمون کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

”اہل یورپ کو سب سے پہلی بات یہ ملحوظ رکھنی چاہیے کہ مسلمانان عالم کو ترکی کے ساتھ قبیح گانگت ہے اور سلطان ترکی کے دنیوی اقتدار کے خاتمہ کا خیال ہی انہیں برہم کر دینے کو کافی ہے، اس موقع پر ہمارا یہ فن سے یہ کہنا بالکل عبث ہے کہ انہیں سلطان کو اپنا خلیفہ تسلیم کرنا چاہیے، چاہیے یا نہ چاہیے، بہر حال واقعہ یہ ہے کہ تسلیم کرتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ خلافت، عباسیہ کے ہاتھ سے نکل کر آل عثمان تک کیونکر پہنچی ہے، لیکن اس راز کے محرم ہونے کے بعد بھی وہ اپنے اس خیال میں بالکل پختہ و غیر متزلزل ہیں یا تاریخی حقائق سے ایک مسلمان فاضل، جلّ مولانا شبلی نعمانی نے بیان کی تھی، اور بعینہ وہی باتیں کہیں جو آج ناکر گریول (یا دوسرے کسی) کہتے ہیں، لیکن باہرین ہمہ اگر آج شبلی زندہ ہوتے تو قسطنطنیہ سے ترکوں کے خزان کی تھیز پر وہ بھی اسی قدر برہم ہوتے جیسے عموماً مسلمانان ہند ہر ہے جن کے بے شبہہ ہم اس پر تاسف کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہ عقاید کیوں ہیں، لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میں یہی عقاید، ایک دوسرے مراسلہ میں لکھتے ہیں:-

دربانی چون بھوان اودناد
نانش حال نیاتی پمچ یاد
جزہان میلے کہ دارد سوسان
خاصہ دردقت بہا رستم
پچو میل کو دکان بامادران
ستر میل خود بداندر بان
پچنین قسیم تا قسیم رفت
تا شد اکون عاقل مردانا و رفت

اس بیان میں مولانا نے اس مسئلہ کو بھی واضح کر دیا کہ انسان کو گوشت اور نباتات کے کھانے کا کون سا ذوق ہے، فرماتے ہیں کہ ہر شے کو اپنی اصلیت کی طرف میل کامل ہوتا ہے، جس طرح شیر خوار بچہ مان کے دودھ سے اپنے کو نشوونما دیتا ہے، اسی طرح انسان جبکی اصلیت نباتات و حیوانات ہیں، اور وہ گویا اسکی مادر فطرت ہے، وہ مجبور ہے کہ اپنے جسمانی نشوونما کو انہیں کے ذریعہ سے ترقی دے اور چاہتا ہے کہ انکو اپنے اندر داخل کرے، مولانا کا اس پر

پچو سبز بار بار دیدہ ام
ہفت صد مہتا و قالب دیدہ ام

سے اکثر فائیکس تنازع نے مولانا کے معتقد تنازع ہونے پر استدلال کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، مولانا دیگر حکماء کی مسئلہ تجدد و امثال کے قائل تھے، یعنی یہ کہ ہر انسان کے جسم کے ذرات بدلتے رہتے ہیں، اور اس طرح جسم باوجود یکسانیت اور ایک ہی طرح نظر آنے کے ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، فرماتے ہیں،

پس ترا ہر لحظہ مرگ رہے بہت
مصطفیٰ زود دنیا سارے بہت

بر نفس نومی شود دنیا و ما
بے خبر از نوشدن اندر بقا

مگر چون جسے نوافوی رسد
مستمرے می نماید در جسد

تیسرے وقت گروہ نے ”اے“ کے عدد کو اپنا نشان راہ مقرر کیا، مولانا کے کلام میں ”مفتقد و مفتاد“ کے الفاظ مضمون نگار نے بجا ہی کہی ہیں، وہی عدد کا مقدس عدد ہی لیکن ہر ادنیٰ فارسی دان جانتا ہے کہ مفتقد و مفتاد، جو نہ کہ مسلمان بھائیوں میں جو علی معتقد تنازع ہے، مضمون نگار نے اسکا نام ہی نہیں لیا، وہ شیخ الاشراق شہاب الدین ہیں، حاکم الاشراق میں اس پر پورے جاننے والے فلسفیاء کے علاوہ قرآن مجید بھی استدلال کیا ہے۔ ذکر یا رازی بھی لکھتے ہیں:-

”اسلام محض ایک مذہب کا نام نہیں، وہ ایک تمدن بھی ہے۔۔۔۔۔ مسلمانان عالم تہذیب و
دینیہ میں، اور وہ اس تمدن کے فنا ہو جانے کے خیال کو بھی نہیں برداشت کر سکتے، ان کا یہ اعتقاد ہے
ہیں بھی اس اعتقاد میں ان کا شریک ہوں، کہ اس اسلامی تمدن کا فتور نہ کسی غیر اسلامی حکومت کے
ہندوہی نہیں سکتا۔“

نامور مشرقی پروفیسر براؤن نے بھی اس بحث پر ٹائمز میں ایک مضمون لکھا ہے اس کے آغاز میں
”مجھے ہمیشہ اس امر پر سخت حیرت رہی ہے کہ جو لوگ محمد کی رسالت کے منکر ہیں وہ کیوں اس بحث میں
استعداد و دماغ صرف کرتے رہتے ہیں کہ خلافت یا نبیائت کا حقدار کون ہے، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے
جیسے مسلمان اس فیصلہ کے درپے ہو جائیں کہ مسیحیوں میں پوپ، یا حامی ملت کے لقب کا حق کس کو پہنچتا ہے۔“

اس کے بعد وہ متعدد تاریخی واقعات کے استناد سے یہ دکھاتے ہیں کہ یہ مسئلہ مسلمانوں میں ضرور
رہا ہے، چنانچہ خارج نے تو یہ اہستہ کر دی کہ قریش کے مقابلہ میں اونی ترین قوم کے فرد کو ترجیح دینے لگا
وہ لکھتے ہیں کہ سلاطین آل عثمان منصب خلافت کے کچھ آج مدعی نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اگر سلطان سلیم
میں تو اس کے فرزند سلیمان غلام (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) کے زمانہ سے تو ان کا یہ دعویٰ بہر حال چلا آتا ہے
کی وفات پر بنتی ابوالعزیز نے عربی زبان میں جو مرثیہ کہا تھا، اس میں تصریحاً اسے ”خليفة الله“ کے لقب سے
یہ مرثیہ دسٹیفیلڈ کے ”آثار مکہ“ جلد ۲ صفحہ ۲۸ تا صفحہ ۳۰ میں مندرج ہے، مزید شہادت فرمایا
مرتب کردہ کاغذات سرکاری سے ہم پہنچ سکتی ہیں، پروفیسر براؤن، سر اوردوکر میسی کے الفاظ ذیل سے
بحرف اتفاق ظاہر کرتے ہیں کہ

جب سلیم نے مصر فتح کیا تو وہ بان عباسی نسل کا خلیفہ فرمانروا تھا، سلیم نے اسے اس پر تادہ کیا اور

Stenfeld's chronicle of the city Mecca

Arabic state papers.

خلافت کو باغیض سلیم اور اس کی نسل کی جانب منتقل کر دے، ساتھ ہی سلیم نے خلافت کے آثار ظاہری بھی
کچھ عامل عباسیہ چلے آتے تھے، اپنے قبضہ میں کر لے، یعنی علم مقدس، دشمنی اور داسے پیمبر (تاریخ انوار کاشانی
صفحہ ۱۰۰)

پروفیسر موصوف، سر پیٹر ڈمارٹین کے اقتباسات مندرجہ بالا کی پوری تائید کرتے ہیں، اور اپنے
مذہب کو یوں ختم کرتے ہیں:-

”اگر گنجائش ہوتی تو میں انہی بیانات بالا کی تائید و توثیق میں اور بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، اب وقت
ایک ہے کہ اگر دنیا کے مہمات مسائل کو پوری طرح سمجھنا ہے تو سیاسی ہنگامہ آرائی کے بجائے سنجیدگی کے
ساتھ تاریخی حقائق و واقعات پیش نظر رکھے جائیں۔“

ہند اور وحشی انسان

ہند اور انسان کا قومی تعلق سائنس کا ایک اہم مسئلہ ہے، حال میں انگلستان کے ہفتہ وار رسالہ
پاپر سائنس میگزین نے اس موضوع پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے، صاحب مضمون کا دعویٰ ہے کہ روزانہ
دنیا کے بہت سے اعمال جنہیں کسی خاص غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً جہاڑ و دنیا، خندق کو دنا وغیرہ
یہ ہیں جو بڑے قسم کے ہندوؤں سے لئے جاسکتے ہیں، اور اس طرح انسانوں کی ایک بڑی جماعت ان مشاغل سے
کام ہو کر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔

صاحب مضمون کی روایت ہے کہ حال میں ایک مقام پر اتفاق سے دوسرے جمع ہوئے، ان میں سے
ایک کے ہمراہ ایک بڑے قد کا چمپانزی بندر تھا، اور دوسرے کے ساتھ افریقہ کا ایک وحشی انسان تھا جو
بہت ترن دماغی سطح رکھتا تھا، جسے ان دو مابین مانس کہتے ہیں، ان دونوں کے خصائص دماغی کے مقابلتہ

Cressy's history of Ottoman Turkey.

معلوم ہوا کہ چمپانزی کسی حالت میں بن مانس سے عقلاً کم نہیں،

”اس وحشی انسان کی زبان میں کل ۵۰ الفاظ ہیں اسکا حافظہ بے شبہ نہایت قوی ہے لیکن استدلال و استنباط کی قوت گویا مفقود ہے، چنانچہ لفظ ”پرسون“ کا کوئی مفہوم ہی اسکے دماغ میں نہیں پیدا ہوتا، اور نہ وہ تین سے زائد گنتی گن سکتا ہے، وقت و زمان کا چونکہ اسے کوئی تجل نہیں اسلئے وہ اپنی عمر بھی نہیں بیان کر سکتا، لیکن غالباً اسکی عمر ۲۰ سال کی ہے، زمین پر جبار و دیے وقت اگر وہ کی گرائی پوری طور پر رہے تو وہ نیک کام کرتا ہے، لیکن اگر نگاہ ذرا چوک جاتی ہے تو وہ سارخس و خاشاک سابق کی طرح از سر نو زمین پر بکھیر دیتا ہے، اسے جلد غصہ نہیں آتا بلکہ علی العموم وہ بہت ہی خوش مزاج و چمپانزی اسکی زبان میں ”مان“ اور ”باپ“ کے لئے الفاظ ہیں مگر وہ دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔“

اسکے مقابلہ میں چمپانزی جبکہ کان بہت بڑے ہیں، اسکی عمر ۱۲ سال کی ہے، اور قدم رفتاری اسکا وزن ۴۰ پونڈ (تقریباً) ما سیر ہے، محققین کا اسپر اتفاق ہے کہ اسکے اعمال سے صاف قصد و مقصد نظر نہیں آتا، مترشح ہوتا ہے، اسکو جب کوئی شخص مٹائی دیتا ہے تو وہ اسے اپنے آقا کے حسب ہدایت اُسی کے ہاتھ میں لیکن اگر مٹائی کی ڈلی ایک سے زائد ہوتی ہے تو ایک وہ اپنی پتیلی میں چھپا لیتا ہے، اسپر اگر آٹا دانستہ کرتا ہے تو وہ اپنی بے قصوری ثابت کرنے کو خالی پتیلی اُسے دکھا دیتا ہے، اس فعل کا صدور ظاہر ہے کہ وہ اسکی دس طاقت کے نہیں ہو سکتا۔

ایک مرتبہ سنگ مرمر کے دس ٹکڑے اُسے کھیلنے کے لئے دیئے گئے، جن سے وہ دن بھر کھیلتا رہا، وہ بکس جہین وہ ٹکڑے تھے، اُس سے لیلیا گیا، اور ان میں سے دو ٹکڑے غائب کر دیئے گئے، اب وہ بکس دوبارہ اُسے دیگیا تو اُس نے آٹھون ٹکڑوں کو گن کر باقی دو کی تلاش شروع کی،

اس وحشی انسان کے مقابلہ میں جو تین سے آد پر گنتی نہیں جانتا، یہ بندر گویا نوٹن تھا جو آٹھون گن لیتا تھا، اور جمع و تفریق سے واقف تھا۔

انجیل علیہ

ماہ گذشتہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ایک بلند پایہ کتاب مسلمانوں کے فن تعمیر پر شائع کی ہے جسکا نام ”اسلامی طرز تعمیر اسکا آغاز و ارتقاء“ (Muslim Architecture its origin and development) ہے، اصل مصنف ایک اطالوی محقق، جی۔ بی۔ ٹی، ریبویرا ہے، اطالوی زبان سے انگریزی ترجمہ سٹر رشورٹھ نے کیا ہے، کتاب میں اصل بحث مسجد و محراب کے طرز تعمیر اور اسکی تاریخ سے لگی ہے، ایکسٹنسیو تصاویر بھی شامل ہیں،

•••••

حیدرآباد دکن کی مجلس آثار قدیمہ (آرکیالوجیکل سوسائٹی) نے اپنے بانی سر الگز نڈر پننے کی یادگار میں ہر دوسرے سال ایک طلائی تمغہ اس شخص کو دینا تجویز کیا تھا جو دکن تاریخ یا آثار قدیمہ پر بہترین تصنیف کرے، چنانچہ مسئلہ میں چھ مختلف اصحاب نے اس تمغہ کے حصول کی کوشش کی، فیصلہ کرنے والی کمیٹی کے تینوں اراکان آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشاہیر فضلاء تھے، یعنی ڈاکٹر اسمتھ (ماہر فن تاریخ)، ڈاکٹر کروک (ماہر علم الانسان) و ڈاکٹر میرٹ (ماہر علم الاجتماع) اس کمیٹی نے سب سے بہتر تصنیف سٹر ہنری کروئس کی قرار دی، جسکا عنوان ”بیجا پور اور اسکے آثار“ ہے، دوسرے نمبر پر پروفیسر پنچانن ستر کی تصنیف ”دکن کی اقوام و تہذیب عصر قبل تاریخ میں“ قرار پائی۔

•••••

علم ہیئت کی ایک فاضلہ مس لوس نے حساب لگا کر بتایا ہے، کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ سے جسکی شرح رفتار ۱۰۰ میل فی گھنٹہ ہو، اگر آسمان کی سیر کی جائے اور درمیان میں مطلق توقف نہ کیا جائے، تو انسان پانچ ہفتوں میں

مترک پہنچ سکتا ہے، زہرہ تک کچھ اوپر ۱۴ سال میں، مربع تک ۲۷ سال میں، مشتری تک دو سو برس میں، زحل تک ساڑھے چار صدیوں میں، عطارد تک کم و بیش ایک ہزار سال کی مدت میں، اور پھون تک ہزار سال میں!

ہر شخص جانتا ہے کہ سال عیسوی ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے، جبکہ بعض مہینہ ۳۰ اور بعض ۳۱ دن ہوتے ہیں، حال میں امریکہ میں یہ تحریک زور و شور سے ہوئی ہے، کہ سال کے سب مہینے مساوی مدت کے ہونے چاہئیں، اس مہینہ ۲۸ دن کا ہونا چاہیے، اس حساب سے بارہ مہینوں کی مجموعی مدت ایام ۳۶۵ دن کی ہوتی ہے، اس کے لئے یہ تجویز ہے کہ ایک تیر ہوان مہینہ لبرٹی کے نام سے اضافہ کیا جائیگا، جو فروری و مارچ کے درمیان ہوگا اور جو ۲۹ دن کا ہوگا، اس تقویم میں سولہت یہ ہوگی کہ ہر ماہ دو شنبہ سے شروع ہوگا، اور یکشنبہ کو ختم ہوگا، اور جس روز جو تاریخ پڑے گی اسی کے مطابق ہمیشہ واقع ہوتی رہے گی، ۲۸ دسمبر کو یکم جنوری کے درمیان ایک نئے دن کا اضافہ کیا جائیگا جس کا نام محض "فردز" ہوگا، علیٰ ہذا حساب کو درست کرنے کے لئے ۲۸ فروری کو یکم مارچ کے درمیان ایک نیا دن بڑھانا پڑیگا جس کا نام "یوم اصلاح" ہوگا، اگر یہ تحریک مقبول ہوگی تو ۲۲ دسمبر سے پہلے شروع ہو جائیگا،

لیکن یہ مسافیتیں اگر روشنی کی رفتار سے طے کیجائیں جسکی شرح ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی ثانیہ ہے، کرہ ارض کا چکر ۲۴ گھنٹہ میں لگایا جاسکتا ہے، مترک ۱۱۰ سکند میں پہنچا جاسکتا ہے، آفتاب تک ۸ منٹ میں اور پھون تک کچھ اوپر چار گھنٹہ میں،

یہ حال سیاروں کا تھا، ثوابت (ستاروں) کا فاصلہ ان سے بدرجہا زائد ہے، انکی خانج از و قیوم سافت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی جہاز کے ذریعہ سے جسکی شرح رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو، اور جو ایک لمحہ کے لئے بھی کہیں توقف نہ کرے، پھون سے قریب ترین ستارہ تک سفر کیا جائے، تو اس میں ایک کروڑ ۴ لاکھ سال کی مدت صرف ہوگی، اور اس اشار میں خود نظام شمسی معلوم نہیں کہ ان سے کہاں پہنچ جائے، اسلئے کہ آفتاب سے اپنے نظام کے برابر ۱۲ میل فی سکند کے حساب سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

آخری اعداد کے بموجب سال گذشتہ میں ہندوستان میں مدارس کی تعداد ۱۹۴۹۱۹ تھی، ان میں پانچ سال پوستانہ کے ۱۴۴۴ کا اضافہ ہوا، طلبہ کی مجموعی تعداد ۷۹۴۸۰۰۰ تھی، ان میں بہ نسبت سال پوستانہ کے ۹۴۲۲ کا اضافہ ہوا، سال پوستانہ میں آبادی کے تناسب سے طلبہ کی تعداد ۲۲۲۲ تھی، سال گذشتہ میں ۲۲۲۲ تک پہنچی، اساتذہ کی مجموعی تعداد سال گذشتہ ۲۹۲۷۳۹ تھی، جن میں سے ۵۵۴۲ ٹرینڈ تھے، ۱۹۸۷ زیر تربیت تھے۔

انوار علیک سید

نامہ سرسید و شبلی

دربارہ تفویض تعلیم دینیات مولوی عبداللہ صاحب نصاری

قبلہ ام۔ آداب، مولانا عبداللہ صاحب نصاری ماشاء اللہ جلیل القدر فاضل اور ممتاز
ابا برکت شخص ہیں، اب یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ جو کہ خاکسار کا لکھ کلاس کے طلبہ
پڑھاتا ہے، وہ مولانا صاحب ممدوح کے تعلق کر دیا جائے، علاوہ عمدہ تعلیم پانچویں طلبہ کو انکی برکت
روزانہ مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔

شبلی

۲۰ جنوری ۱۸۹۵ء

شمس العلماء مولوی شبلی صاحب،

یہ کام مولوی عبداللہ صاحب کے متعلق نہیں ہو سکتا، ان سے ایک خاص کام طے ہوا ہے
دیگر خدمات سے ہمیشہ مشغول رہیں گے، لہذا یہ کام انکے متعلق کرنا مناسب نہیں ہے، آپ بروہن
بخوشی خاطر یہ کام کر رہے ہیں، اب کیون خود غرضی سے جی چراتے ہو،

سید احمد

۲۰ جنوری ۱۸۹۵ء

قبلہ ام۔ اگر جناب کو کچھ خرابی کا احتمال ہو تو مولوی عبداللہ صاحب کے تعلق یہ کام صرف ایک
دو مہینے کے لئے کر دیا جائے، میری یہ استدعا ایک معمولی بات تھی لیکن بعض وقت بد قسمتی سے جہاں
بات بھی ایک امر مهم نہ جاتا ہے، جب مولوی صاحب ہر ہفتہ نہایت تفصیل و توضیح کا موقع پا کر غلط

کام ہو گئے ہیں تو ترجمہ میں کیون نہ احتیاط کریں گے، میں پہلے روز انکو قرآن کے گمنامہ میں بلا کر دیکھا دوں گا
میں اس طرح پڑھاتا ہوں اور آپ کو بھی یوں ہی پڑھانا چاہیے، وہ ضرور اسی طرح پڑھائیں گے، کالج کا
بچہ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، بلکہ جو شخص خاص دینیات کے لئے ایک معقول مشاہرہ پاتا ہو،
کالج کی انتظامی حیثیت سے یہ کام اسکے تعلق ہونا بہتر ہے، میری ذاتی غرض صرف اس قدر ہے کہ مجھکو
کچھ پڑھنے کے لئے وقت نکل آئیگا، ورنہ چونکہ جائزوں میں مدرسہ ۹ بجے سے ہوتا ہے اور صبح
بچے ہوتی ہے، اسلئے ضروریات سے فاسخ ہو کر ذرا دیر کے بعد کھانا کھانے کے مدرسہ کے
کمرے پر جاتی ہے، اگر میری اس استدعا کو میرے جی چرانے اور کسی قسم کی خود غرضی پر محمول کیا جائے
تو میری کمال بد قسمتی، اس باب میں میرے یہ آخری کلمات ہیں۔

شبلی

۲۲ جنوری

مولوی شبلی صاحب،

آپ نے اپنی طولانی تحریر کو ایسے عنوان سے شروع کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجھکو
یہ کام پر اطمینان نہیں، (حاشا دکلا) اگر ایسا ہوتا تو ایسا عظیم الشان کام جو کہ کالج کی
اس سے انکے سپرد ہو کر نہ کیا جاتا، مجھے ان پر بہت بڑا اطمینان ہے، وہ صد ہا علماء میں سے اس
مقام پر کام کے واسطے منتخب کئے گئے ہیں، شاید آپ کا خیال خرابی یا بے اطمینانی کی طرف میرے
لفظ سے کیا ہو گا کہ (یہ کام انکے متعلق کرنا مناسب نہیں) اسکے یہ معنی ہیں کہ میں کسی طرح انکے
کام کوئی کام انکے متعلق کرنا پسند نہیں کرتا، مگر میں منشی سعید احمد صاحب کی معرفت مولوی صاحب کی
کامیابی کی دریافت کر دوں گا۔

۲۲ جنوری ۱۸۹۵ء

اشیاء بزم سخن

جولائی کے وسط ہفتہ میں ہندوستان میں ہر جگہ برسات کا موسم ہو گا لیکن دارالمصنفین میں ان دنوں فصل بہار بھی کہ بعض وہ احباب جنکے وعدوں پر کئی بہارین گذر چکی تھیں اور وہ پورے ہین ہوتے تھے اس ہفتہ میں تکمیل کو پہنچے، یہ سارا ہفتہ گو علم و فن اور شعر و سخن کے تذکرہ سے معمور رہا، لیکن وہ لذت کیف اب تک باقی ہے، جب ایک شب ماہ میں یہ طے پایا کہ ہر صاحب اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے مرزا غالب کا ایک ایک شعر جو انگریزیک بہترین شاعریوں میں ادبی دسترخوان پر جو سامان ضیافت جمع ہوا چونکہ وہ سفرہ عام تھا اسلئے ہم انکو اپنے ناظرین کے سامنے بھی آج چن دیتے ہیں،

پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی،

عمر ہین سبے تو ہی نواہے راز کا

جی دعو نہ تا ہی پھر دی نصرت کرا دن

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی،

اچا ہے سر انگشت حنائی کا تصور

مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے،

مستی کے مت فریب میں آجائو اسد

ہاں کہا یو مت فریب مستی

سید سلیمان ندوی،

قید حیات و بند غم اہل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پا گیا

مولوی ابوالحسنات صاحب ندوی،

رنج سے خوگر ہوا انسان تو بھاتا ہے رنج

جانفزا ہے بادہ جسکے ہاتھ میں جام آگیا

مولوی ضمیر الدین صاحب بی۔ اے ال۔ ال۔ بی،

نہ گل نمہ ہوں نہ پردہ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فریاد کب

صافی غم و شادی کا ہین قوم میں اب جس

پابند ہیں اسکے رزدیوشن جو ہوا پاس

چشم عقلا سے یہ بصیرت ہوئی مفقود

ہنسے پہ بھی تیار ہیں رونے کو بھی موجود

انور سے کہا میں نے کہ خاموشی تو کین تم

بابو کے نہ دساز نہ یاروں کے ہم آواز

کنے لگے کیا آپکو معلوم ہین ہے،

آزرا کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

تقریر نہ تحریر نہ غصہ نہ خوشامد

ماہی میں نہ ممتاز نہ اشتہر میں سرآمد

آزرا کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

آزرا کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

چرخ نے پیش کشن کہد یا اظہار میں

شہر افسردہ پرے ہیں اور مرید اولہ ہیں

شہر افسردہ پرے ہیں اور مرید اولہ ہیں

شہر افسردہ پرے ہیں اور مرید اولہ ہیں

قوم کا لچ میں اور اسکی زندگی اخبار میں

بیان اسکول میں دین، شیخ بھی دربار میں

بیان اسکول میں دین، شیخ بھی دربار میں

بیان اسکول میں دین، شیخ بھی دربار میں

فکر سہیل

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ال ایل بی

سنائیں کسکو اتنی غصہ نہان اپنا
اس انجن میں نہیں کوئی ہمزبان اپنا
بلانہ بجزی میں کہیں فشان اپنا
سراغ ہم نے لگایا کہاں کہاں اپنا
مٹایا ہم نے محبت میں فشان اپنا
ہنر کا مگر اب بھی وہ بدگمان اپنا
ہنیں ہے خوفِ اسیری سے ہمت پر طرز
ہمیں تو کچھ نفس ہے یہ آشیان اپنا
بڑی ہے صورت طیارہ رفعت پر طرز
دہان زخم پر کودی ہے رعبِ خون نے مہر
ہمیشہ سینے میں گھنکر رہا دیوان اپنا
مجھے بھی اذنِ فغان بل سکے تو مرغِ اسیر
کسی طرح تاملے داوخت جانی کی
تری چھری سے نہ جھپکیگی آنکھ اسی یاد
یہ امتیازِ من و تو مٹا، محبت میں
نقد میں کوئی نہیں ہے شریکِ تنہائی
اتنی خیر کہ صیاد لیکے دستہ گل
دیارِ حسن کی آب و ہوا، معاذ اللہ
دفا فروش نہیں ہم کہ مثلِ لالہ و گل
یہ امنِ سلطنت حسن ہے کہ اہل وفا
صدائے زنگ لالہ دلِ پیامِ عبرت ہے
سکوتِ شمع پہ صدقے ہزار نطقِ سہیل
یہ کہ سکی تو سر بزمِ سوز جان اپنا
ازل سے برق کا دامن پر آشیان اپنا
کہ آپ پر مجھے ہونے لگا گمان اپنا
بلا سے ایک زمانہ ہے نوہ خون اپنا
چلا ہے آج سجانے کو آشیان اپنا
کمان سے بھول پڑا ہمیں کاروان اپنا
پھرین دکھاتے ہوئے زخمِ خونچکان اپنا
ہتیلی پرٹے پھرتے ہیں نقد جان اپنا
روان ہے سوزِ لبِ ستی سے کاروان اپنا
یہ کہ سکی تو سر بزمِ سوز جان اپنا

بالتیظ والاعتناء

تاریخِ تعلیم، مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ایم اے ڈی ایس سی پرنسپل علیگندہ کالج بھٹکست ۱۲۴ صفحہ ۲۶۶-۲۶۷ قیمت ۲۰ روپے۔ دفتر کافرنس علیگندہ۔

ڈاکٹر صاحب ہماری قوم میں بحیثیت ماہر فن تعلیم مدت سے شہرت رکھتے ہیں چنانچہ آج سے تیرہ چودہ برس پیشتر جب وہ یورپ سے واپس آئے ہیں، اسی وقت سے انکی ذات سے بہترین تعلیمی توقعات وابستہ ہو گئی ہیں جو انفس سے کہ اب تک برائے نام ہی پوری ہوئیں، تاریخِ تعلیم انکی شاید سب سے پہلی تالیف ہے۔

بقول مولف تاریخِ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ

نوع انسان نے جو ترقی ہر ملک ہر زمانہ و ہر قرن میں ذہنی و اخلاقی حیثیتوں سے کی ہے، اسکے تمام حالات و کیفیات اور اسکے متعلق تمام معلومات

واقف کے جائزین، اس قدر وسیع موضوع کو سنبھالنا کوئی آسان امر نہ تھا، جناب مولف کو خود اعتراف ہے کہ

”یہ مختصر اور ان اسکے بیان کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتے“

اس لئے انھوں نے اسکی صرف ایک شاخ فنِ تدریس کو انتخاب کیا، اور اسکو بھی چار حصوں میں تقسیم کیا، جن میں سے صرف حصہ اول ہنوز شائع ہوا ہے، اس حصہ کا موضوع ”مسئلہ تعلیم کی تاریخ علمی و عملی حیثیتوں سے بیان کرنا ہے“

نہید کے بعد صفحہ ۶ پر ”باب اول“ درج ہے، جسکے پیچھے کوئی توضیحی عنوان نہیں، ”باب اول“ سے تعلق تو یہ ہے متبادر ہوتا ہے کہ آگے اور ابواب بھی ہونگے، لیکن شاید ساری کتاب ایک ہی باب کے نذر ہو گئی، جو جس اچانک طریقہ پر کتاب کا خاتمہ ہوا ہے، اس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ غالباً باب اول کا کچھ جزو اب بھی باقی ہو گیا ہے جو آئندہ حصوں میں درج ہوگا،

یہ سوانح پر فہرست مضامین بہت سہولت پیدا کر دیتی ہے، لیکن اس کتاب میں شاید فہرست کا اندراج

بھی سہوار ہو گیا۔

فن تدریس کے مورخ سے توقع یہ تھی کہ قدیم متدین اقوام کے طریقہ تدریس پر شرح و بسط سے گفتگو کریگا لیکن تاریخ التعلیم میں متعدد اہم اقوام قدیمہ مثلاً اہل چین و اہل مصر کا مطلق ذکر نہیں، اور ہندوستان اور بنی اسرائیل کا صرف دو دو صفحوں میں ذکر ختم کر دیا گیا ہے، جس سے معلوم نہیں ناظرین کے کس طبقہ کی معلومات میں اضافہ ہوا تھا؟ یونان، ممالک اسلامی اور یورپ کے مشاہیر علماء تعلیم کے اصول و خیالات پر البتہ کیسے تفصیل سے لکھا لیکن یہ معلومات تمام تر وہ ہیں جو اس فن سے متعلق انگریزی کی ہر متداول کتاب میں ملجاتے ہیں،

اعداد و واقعات کی نقل میں سماعت و بداحتیاطی کی جا بجا مثالیں ملتی ہیں، صفحہ ۱۱۰ پر تحریر ہے کہ مشہور ترین کتاب "کا نام" فلسفہ ترکیبی "تھا، حالانکہ اس نام سے اسکی کوئی کتاب موسوم نہیں، "فلسفہ ترکیبی" درحقیقت اسکے پورے نظام فلسفہ کا نام تھا، جسکے سلسلہ میں اس نے متعدد مجلدات تیار کئے ہیں، یہ بالکل ہی ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ مولانا شبلی کی بہترین تصنیف کا نام "سلسلہ آصفیہ" تھا۔

اسی صفحہ پر اسپنسر کا سال وفات ۱۸۸۳ء لکھا ہے، حالانکہ وہ ۱۸۹۳ء تک زندہ رہتا اس طرح کی متعدد مثالیں دی گئی ہیں کتاب کی زبان و طرز ادا کے متعلق افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اسپنر کی قسم کی دلکشی نہیں، اکثر مقامات پر صاف ترجمہ معلوم ہوتا ہے، اور ترجمہ بھی لغوی جملوں کی ساخت و ترکیب عموماً اردو کے لئے نامانوس ہے، دو ایک لفظ تقویر پر صفحہ پر ایسے آگے ہیں جو ادنیٰ توجہ سے درست ہو سکتے تھے، صفحہ ۱۶ پر "مادہ پرستی" یا "مادیت" کے بجائے "مادیت پرستی" "اولیٰ" کے بجائے "اولیٰ تر"، "صریحاً غلط ہیں، کہیں کہیں عبارت بالکل بے معنی ہو گئی ہے،

لیکن باوجود ان کمزوریوں اور لغزشوں کے کتاب کا مطالعہ فی الجملہ بہت ناظرین کے لئے مفید ہوگا اور بحیثیت مجموعی ہیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اگرچہ تاریخ التعلیم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی تعلیمی شہرت سے بہت ہی فخریہ تاہم اردو کی نلکاری کو دیکھتے ہوئے یہ بھی غنیمت ہے، ڈاکٹر صاحب اگر آئندہ ایڈیشن میں زیادہ توجہ و احتیاط ملحوظ رکھیں تو یقیناً اس سے بہتر و مفید تر کام کر سکتے ہیں۔

مطبوعات عجمیہ

مشاہیر یونان و رومہ جلد دوم، یونانی حکیم پلٹارک کی مشہور کتاب "پیرل لائوز" کا اردو ترجمہ، از جناب سید انجمی فریادادی، شائع کردہ انجمن ترقی اردو، اس کتاب کا پہلا حصہ گذشتہ سال شائع ہو چکا ہے، اب اسکا دوسرا حصہ شائع ہوا ہے، یہ یونان و رومہ کے مشہور خطباء اور رجال سیاست کی سوانح و حیات ہیں جنہیں نہایت خوبی کے ساتھ ان خصوصیات کو نمایاں کیا گیا ہے، جو انکی کامیابی اور شہرت و دام کا باعث ہوئیں۔

ترجمہ کی عبارت جلد اول سے بہت زیادہ سلیس، روان اور صاف ہو گئی اب بھی ناقدین کہیں کہیں لغوی کثرت کر سکتے ہیں، لیکن کم ہماری رائے میں جناب مترجم مجموعی حیثیت سے اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں، اور کلام ہر آئندہ سال گذشتہ سال سے بہتر نمونہ پیش کر رہا ہے، صفحہ ۳۷۸، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ سفید، قطع کتابی، قیمت مجلد عجمی غیر مجلد عجمی، پتہ:- صدر دفتر انجمن ترقی اردو اور رنگ آباد، دکن،

رسالہ علم نباتات، اردو زبان میں فلاح و باغبانی پر گو بہت پرانی کتابیں موجود ہیں، لیکن مستقل علم نباتات پر ایک کوئی کتاب موجود نہیں تھی، اسباق الاشیاء میں مولوی باتین ہوتی ہیں، جناب مولوی محمد یوسف صاحب مدنی ایم آر اے، میں بہت کچھ شکر یہ و تحسین کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے ایک مختصر رسالہ اس علم میں لکھا ہے، اردو زبان کے ساتھ لکھا ہے، رسالہ ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوا ہے، امید ہے کہ ملک مصنف کی اس پہلی کوشش کی داد دیگا، صفحہ ۳۷، قطع اوسط، کاغذ عمدہ، لکھائی چھپائی صاف، قیمت مجلد عجمی، پتہ:- صدر دفتر انجمن ترقی اردو اور رنگ آباد، دکن،

ماہ عجم، مولوی راشد انجیری صاحب دہلوی محتاج تعارف نہیں، انکے افسانے ملک میں مقبول ہو چکے ہیں، ماہ عجم انہی کی قوت فکر کا نتیجہ ہے، افسانہ کے پیرایہ میں اس وقت کے واقعات لکھے ہیں، جب

اسلامی فوج کا سیلاب عظیم عراق عرب سے گذرتا ہوا سرزمین ایران میں موجیں مار رہا تھا، ناظرین کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے، اس میں انھوں نے داستان حسن و عشق بھی چھیڑ دی ہے، اور جہان ایک طرف، اس میں اسلامی فوج و جنگی حالات کا مرقع دکھایا ہے، نہایت حسن و خوبی کے ساتھ جذبات عشق و محبت کی حالت میں بھی مسلمانوں کے عمدہ کیرکیر اور محاسن اخلاق کو بھی نمایاں کیا ہے، حق یہ ہے کہ مصنف نے افسانہ نویسی کے تمام اصولوں کو بروی کار کیا ہے، کامیابی کے ساتھ بنا ہوا ہے، زبان عمدہ، سلیبی ہوئی اور صاف ہے، داستان کا مجموعی مرقع و ترتیب بھی عمدہ ہے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ اس میں انشا پر دازی صرف لگی ہے، ایک ہی مفہوم کے جملے متدہر و تکرار آدائے گئے ہیں، اور کہیں کہیں کئی کئی سطروں تک چلے گئے ہیں، نادولن اور افسانوں میں ناظرین کو آئینہ و آئینہ کا انتظار رہتا ہے نہ کہ مصنف کے متحد المفہوم جملوں کا، لکھائی چھپائی صاف، عمدہ، کاغذ سفید، قطع کتابی، صفحہ ۱۱۲، قیمت خریداران رسالہ لکھنؤ ۸ روپے، دیگر حضرات سے غدار

پتہ :- میجر رسالہ لکھنؤ، لاہور

تفسیر نامہ، شہزادی مولانا روم علیہ الرحمہ کے ابتدائی دو شعروں کی تفسیر لکھی ہے، تشریح اور توضیح جو کہ کی گئی ہے، اچھی اور غنیمت ہے، صفحہ ۸ قیمت ۲ روپے، پتہ :- منشی حاجی معین الدین صاحب، انجمن مراد آباد، لیلائے تہذیب، جناب ابن عیسیٰ صاحب جاندہری کی ایک تقریر ہے جو انھوں نے آل انڈیا راجین کافر میں کی تھی، اس میں قوم کو مذہبی تعلیم و ضروریات کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، آخر تقریر میں انھوں نے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے مذہب کا نام لیا ہے، جہاں مذہبی و دنیاوی دونوں تعلیموں کا انتظام ہے، صفحہ ۱۲ پتہ :- بنی بخش پبلشرز پویشیا پور، (پنجاب)

ارمغان کلکتہ، حاجی اسماعیل سیٹھ صاحب منوم مدراسی نے اپنے سفر کلکتہ کے واقعات جمع کئے ہیں وہ جب کلکتہ پہنچے تو ان کے اعزاز میں شعراء کلکتہ نے جو بزم مشاعرہ منعقد کی، اسکی غزلیں بھی اس میں درج ہیں، شعراء کلکتہ کے مختصر حالات بھی ہیں، صفحہ ۸،

ماہ ذوالحجہ ۱۳۷۰ مطابق ستمبر ۱۹۵۰ء

عدد سوم

مضامین

شذرات

مجموعہ اور تصویر کے متعلق اسلام کا شرعی حکم، سید سلیمان ندوی ۱۴۷ - ۱۴۸

مذہب اور عقلیات، پروفیسر عبدالباری ندوی، احمد آباد کالج لکھنؤ ۱۸۶ - ۱۸۷

ہندوستان کی گذشتہ اسلامی تعلیم گاہیں، مولوی ابوالحسنات ندوی، رفیق دارالمنین ۱۸۸ - ۱۸۹

مشرقی کتب خانے، مولانا عبد السلام ندوی ۲۰۰ - ۲۰۸

مصریوں کے آداب معاشرت، مولوی عبدالرزاق ندوی ۲۰۹ - ۲۱۳

روح کی بغادت، ۲۱۴ - ۲۱۷

کبیر داس، ۲۱۸ - ۲۲۲

ہندوستان کا ادبی مستقبل، ۲۲۳ - ۲۲۴

اسلامی تمدن و مسیحیت، ۲۲۵ - ۲۲۶

نظام امتحانات، ۲۲۷ - ۲۲۸

ادبیات، شمیم، ہسیل، احسان، نیر، ۲۲۹ - ۲۳۱

اخبار علمیہ، ۲۳۲ - ۲۳۳

تقریبات و آیام، مولوی ابوالحسنات ندوی ۲۳۴ - ۲۳۵

مطبوعات جدیدہ، اخبار الصنادید، شب زندگی، تیار، نچ مرزا، نکاح مرزا، بچوں کا پہلا لال، تمدن ۲۳۶ - ۲۴۰